ISSN 0970-180X

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

جن لوگوں کا عمل انھیں پیچھے کردے
اُن کا قول انھیں آگے نہیں لے جاسکتا

اگست ۱۹۸۷
شمارہ ۱۲۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۹ اگست ۱۹۸۷

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

دو قسم کے انسان

اللہ ولی الذین آمنوا یخرجہم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیائہم الطاغوت یخرجونہم من النور الی الظلمات اولئک اصحاب النار ہم فیہا خالدون۔

(البقرہ ۲۵۷)

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا ان کے دوست شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ آگ والے لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا اعتماد خدا پر ہو، جو اللہ کی بتائی ہوئی باتوں کو سچ جانتے ہوئے اس کی روشنی میں اپنا راستہ طے کرتے ہوں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جن کا اعتماد غیر خدا پر ہو۔ جن کا حال یہ ہو کہ جب انھیں کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ خدا کے علاوہ دوسری دوسری باتوں کی بنیاد پر اپنی راہ عمل متعین کریں۔

جو لوگ خدا کو اپنا ولی و مددگار بناتے ہیں ان کا ذہن خدارخی بن جاتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خدائی انداز میں سوچتے ہیں۔ وہ اپنی تدبیروں سے زیادہ خدا کی مدد پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کے جذبات کا رُخ انسان کے بجائے خدا کی طرف رہتا ہے۔ وہ غصہ اور انتقام کے بجائے ہمیشہ صبر اور معافی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ——— یہ اندھیرے سے روشنی کی طرف سفر کرنے والے لوگ ہیں۔

جو لوگ خدا کو اپنا ولی نہ بنائیں ان کا ولی شیطان بن جاتا ہے۔ ان کا ذہن ہمیشہ تخریب کاری کی طرف چلتا ہے۔ وہ سازش اور انتقام کے طریقوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو ان کا ذہن فوراً منفی تدبیروں کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ ان کو کبھی روشنی میں آنا نصیب نہیں ہوتا ——— یہ وہ لوگ ہیں جن کو شیطان نے اجالے سے اندھیرے کی طرف دوڑا دیا۔ اوّل الذکر گروہ کے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی ہے، دوسرے گروہ کے لیے دنیا و آخرت میں ناکامی۔

بعد از وقت

مسٹر بوکاسا (Jean Bedel Bokassa) ۱۹۲۱ میں پیدا ہوئے۔ وہ سنٹرل افریقہ کی فوج میں جنرل تھے۔ وہ اپنے اس عہدہ پر قناعت نہ کرسکے، جنوری ۱۹۶۶ میں انھوں نے فوجی بغاوت کردی۔ اور صدر ڈاکو (David Dacko) کو معزول کرکے خود سنٹرل افریقہ کے صدر بن گیے۔ جنرل بوکاسا صدر بوکاسا بننے پر بھی قانع نہیں ہوئے۔ کیوں کہ انھیں اندیشہ تھا کہ اگلے الکشن میں وہ صدارت کھودیں گے۔ چنانچہ ۱۹۷۶ میں انھوں نے پارلیمنٹ کو ختم کرکے اپنے شہنشاہ (Emperor) ہونے کا اعلان کردیا۔ اب انھوں نے تاج پہن لیا اور شہنشاہ بوکاسا کہے جانے لگے۔

تاہم مسئلہ اب بھی ختم نہیں ہوا۔ اب شہنشاہ بوکاسا کا سامنا اس چیز سے تھا جس کو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (3/1100) نے (Realities of French economic control) سے تعبیر کیا ہے۔ سنٹرل افریقہ کی قیمتی کانیں فرانس کے قبضہ میں تھیں۔ نئے سیاسی نظام میں فرانس کو اپنا اقتصادی مفاد خطرہ میں نظر آیا۔ چنانچہ فرانس کی مدد سے ۱۹۸۰ میں ایک اور فوجی انقلاب ہوا اور مسٹر ڈیوڈ ڈاکو دوبارہ سنٹرل افریقہ کے صدر بنا دیئے گیے۔ جون ۱۹۸۷ میں بوکاسا کو پھانسی دیدی گئی۔

انقلاب کے بعد مسٹر بوکاسا ملک سے باہر جانے میں کامیاب ہوگیے تھے۔ وہ اکتوبر ۱۹۸۶ میں دوبارہ سنٹرل افریقہ واپس آئے۔ ملک میں داخل ہوتے ہی انھیں گرفتار کرلیا گیا (انڈین اکسپریس ۹ جون ۱۹۸۷) ان کے اوپر بہت سے سنگین الزامات تھے۔ مثلاً ۲۰ آدمیوں کو قتل کرانا، سرکاری خزانہ سے کروروں ڈالر رشوت دینا وغیرہ۔ اسٹیٹ پراسیکیوٹر مسٹر جبریل مبودو (Gabriel Mboudou) نے بینگوئی (Bangui) کی کریمنل عدالت سے کہا تھا کہ مسٹر بوکاسا نے اپنے ۱۴ سالہ زمانۂ حکومت میں جو جرائم کیے ہیں اس کے بعد ضروری ہے کہ انھیں موت کی سزا دی جائے۔ ۸ جون ۱۹۸۷ کو مسٹر بوکاسا کی پیشی عدالت میں ہوئی تو انھوں نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا کہ آج میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ معمولی شہری کی حیثیت سے پُر امن زندگی گزاروں:

Today, I only want to live in peace as a simple citizen.

آدمی اگر قناعت کا طریقہ اختیار کرے تو وہ کبھی ذلت اور ناکامی سے دوچار نہ ہو۔

Swami Vivekananda on Islam

The Hindus may get the credit of arriving at it earlier than other races, yet practical Advaitism, which looks upon and behaves to all mankind as one's own soul, was never developed among the Hindus.

On the other hand, my experience is that if ever any religion approached to this equality in an appreciable manner, it is Islam and Islam alone, I am firmly persuaded, therefore, that without the help of practical Islam, theories of Vedantism, however fine and wonderful they may be, are entirely valuless to the vast mass of mankind.

For our own motherland as junction of the two great systems, Hinduism and Islam, — Vedanta brain and Islam body — is the only hope. I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strife, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body (pp. 379-380).

Letters of Swami Vivekananda,
Advaita Ashrama
5, Dehi Entally Road,
Calcutta, 1970, pp. 463

Indian Muslims at the Crossroads

By Shailendranath Gosh

As one who, early in his youth, was attracted to the Islamic message of social equality and universal sharing of resources and lived, as a peasant organiser, among the Muslim masses for many years in pre-partition Bengal's countryside sharing their ethos; and as one who, in 1947-48, witnessed the depths of their remorse over their earlier separatist craze, I direct this appeal to our Muslim brothers and sisters.

The true interests of the Muslims can be served much better by defining the goal in harmoniously constructive terms rather than in a spirit of separatist negativism. To be better Muslims and more prosperous would be a laudable goal.

My Muslim brethren need to know that I, a Hindu, am interested in the affairs of the Muslims for many reasons. I had hoped that the Indian Muslims, after their chastening experience of 1947, could turn to another road — to find a **separate identity** for themselves by being ahead of others in **creativity** and thus be the harbinger of a new Indian Renaissance. It has happened many times in history that a creative minority has sparked the rebirth of a whole nation.

The Hindustan Times, April 4, 1986

انسانیت انتظار میں ہے

مشہور ہندو عالم سوامی ویویکانند نے لکھا ہے کہ زندگی کے وحدانی تصور (ادویتا واد) پر دوسری نسلوں سے پہلے پہونچنے کا کریڈٹ ہندوؤں کو مل سکتا ہے، مگر عملی وحدانیت جو کہ تمام انسانیت کو ایک سمجھے اور سب سے ایک طرح کا سلوک کرے، کبھی ہندوؤں میں پیدا نہ ہو سکی۔

دوسری طرف میرا تجربہ ہے کہ اگر کوئی مذہب کبھی اس مساوات تک قابل لحاظ طور پر پہونچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس بنا پر میں یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ عملی اسلام کی مدد کے بغیر، ویدانت کے نظریات، خواہ وہ کتنے ہی عمدہ اور حیرت انگیز ہوں، وسیع انسانیت کے لیے مکمل طور پر بے فائدہ ہیں۔

ہماری مادر وطن کے لیے جو کہ دو بڑے مذہبی نظاموں ہندوازم اور اسلام کا سنگم ہے، ویدانت دماغ اور اسلام جسم واحد امید ہے۔ میں اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندستان بحران اور انتشار سے نکل کر شاندار اور ناقابل تسخیر بن رہا ہے اور یہ واقعہ ویدانت دماغ اور اسلام جسم کے ذریعہ ہو رہا ہے۔

مسٹر شیلندر ناتھ گھوش نے لکھا ہے کہ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو اپنی جوانی کے ابتدائی دور میں اسلام کے سماجی مساوات اور عالمی اشتراک کے پیغام سے متاثر ہوا، اور تقسیم سے پہلے بنگال میں مسلم عوام کے درمیان کسانی تنظیم کے تحت رہا اور ان کے عقائد و نظریات سے قریبی واقفیت حاصل کی، اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے ۱۹۴۷-۴۸ میں تقسیم کے بارہ میں ان کے سابقہ دیوانہ پن پر انھیں شرمندہ ہوتے ہوئے دیکھا، میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے نام یہ اپیل جاری کر رہا ہوں۔

مسلمانوں کے سچے مفادات اس طرح زیادہ بہتر طور پر حاصل کیے جا سکتے ہیں کہ ان کی منزل متحدہ تعمیری اصطلاحات میں مقرر کی جائے نہ کہ منفی انداز اور تفریق کی روح کے ساتھ اس کا تعین کیا جائے۔ اچھا مسلمان اور زیادہ خوش حال بننا بلاشبہ ان کا اعلیٰ مقصد قرار دیا جا سکتا ہے۔ میرے مسلمان بھائیوں کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ میں جو کہ ایک ہندو ہوں۔ مختلف

اسباب سے مسلمانوں کے معاملات میں دل چسپی رکھتا ہوں ۔ میں نے امید کی تھی کہ ہندستان کے مسلمان ۱۹۴۷ کے سبق آموز تجربہ کے بعد، ایک اور راستہ کی طرف مڑ سکیں گے، وہ اپنا علاحدہ تشخص اس میں پائیں گے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ تخلیقی ثابت کریں اور اس طرح وہ ہندستان کی نشأۃ ثانیہ کے نقیب بنیں ۔ تاریخ میں ایسا بہت بار ہوا ہے کہ ایک تخلیقی اقلیت ایک پوری قوم کو نئی زندگی کی طرف لے جانے کا ذریعہ بن گئی ہے ۔

تبصرہ

ہندستان کے ہندوؤں میں، میرے اندازہ کے مطابق، پچاس فیصد سے زیادہ ایسے لوگ ہیں جو مسلمانوں کے بارہ میں وہ مثبت اور خیر خواہانہ تصور رکھتے ہیں جس کا دو نمونہ اوپر کے اقتباس میں نقل کیا گیا ہے ۔ یہ لوگ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات، خاص طور پر توحید اور مساوات، سے متاثر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام کی ان قدروں کو ملک میں فروغ دیا جائے ۔ کیوں کہ ان کے بغیر ملک کی حقیقی ترقی نہیں ہو سکتی ۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ مسلمان اٹھیں اور اپنے اس تخلیقی کردار کو ادا کریں ۔ مسلمان امکانی طور پر پوری طرح اس کی استعداد رکھتے ہیں ۔ بلکہ وہی واحد گروہ ہیں جو اس قسم کا مثبت کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ کیوں کہ وہی وہ لوگ ہیں جن کے پاس خدا کی آفاقی تعلیمات کا غیر محرف اڈیشن موجود ہے ۔

مسلمان بلاشبہ اس تاریخی کردار کو ادا کر کے موجودہ ماحول میں اپنے لیے باعزت جگہ حاصل کر سکتے ہیں ۔ مگر اس کردار کو ادا کرنے کی ایک لازمی شرط ہے ۔ وہ شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو وقتی حالات سے اوپر اٹھائیں ۔ وہ یک طرفہ طور پر ہر قسم کی شکایتوں اور ناانصافیوں کو نظر انداز کر دیں ۔ وہ کھونے پر غم کرنا چھوڑ دیں اور محرومی کی تلخیوں کو بھلا دیں ۔ جس دن وہ ایسا کریں گے اسی دن وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ اس ملک میں وہ ایجابی رول ادا کر سکیں جس کا تاریخ کو صدیوں سے انتظار ہے ۔

یہی وہ قربانی ہے جس کو قرآن میں صبر کہا گیا ہے، اور صبر کرنے والوں ہی کے لیے مقدر ہے کہ وہ قانونِ قدرت کے مطابق قوموں اور ملکوں کے قائد بنیں (وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا)

محبت کی طاقت

سوامی رام تیرتھ (۱۸۷۳ - ۱۹۰۶) نہایت قابل آدمی تھے۔ ان کا ایک بہت بامعنی قول ہے: زندگی کے سب دروازوں پر لکھا ہوا ہوتا ہے "کھینچو" مگر اکثر ہم اسے "دھکا" دینا شروع کر دیتے ہیں۔

سوامی رام تیرتھ روانی کے ساتھ انگریزی بولتے تھے۔ وہ دھرم کے پرچار کے لیے ۱۹۰۳ میں امریکہ گئے۔ ان کا جہاز سان فرانسسکو کے سمندری ساحل پہ لنگرانداز ہوا۔ وہ اترے تو ایک امریکی ازراہِ تعارف ان کے قریب آیا۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی:

"آپ کا سامان کہاں ہے" امریکی نے پوچھا۔

"میرا سامان بس یہی ہے" سوامی رام تیرتھ نے جواب دیا۔

"اپنا روپیہ پیسہ آپ کہاں رکھتے ہیں"

"میرے پاس روپیہ پیسہ ہے ہی نہیں"

"پھر آپ کا کام کیسے چلتا ہے"

"میں سب سے پیار کرتا ہوں، بس اسی سے میرا سب کام چل جاتا ہے"

"تو امریکہ میں آپ کا کوئی دوست ضرور ہوگا"

"ہاں ایک دوست ہے اور وہ دوست یہ ہے"

سوامی رام تیرتھ نے یہ کہا اور اپنے دونوں بازو امریکی شخص کے گلے میں ڈال دیے۔ امریکی ان کی اس بات سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے بعد وہ امریکی ان کا اتنا گہرا دوست بن گیا کہ وہ انھیں اپنے گھر لے گیا اور سوامی رام تیرتھ جب تک امریکہ میں رہے وہ برابر ان کے ساتھ رہا اور ان کی خدمت کرتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ ان کا شاگرد بن گیا۔

اس دنیا میں محبت سب سے بڑی طاقت ہے۔ محبت کے ذریعہ آپ اپنے مخالف کو جھکا سکتے ہیں اور ایک اجنبی شخص کو اپنا بنا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ کی محبت سچی محبت ہو، وہ دکھاوے اور نمائش کے لیے نہ ہو۔

سابق شاہ روس

ولادیمیر اوّل (Vladimir I) ۹۵۶ءمیں پیدا ہوا، اور ۱۰۱۵ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ روس کا پہلا عیسائی بادشاہ ہے۔ وہ ابتداءً بت پرست تھا۔ اس نے عیسائی مذہب قبول کرلیا۔ اس کے بعد اس نے روسی باشندوں کو عیسائی بنانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔ تمام بُت دریاؤں میں پھینک دیئے گیے۔

گیارھویں صدی عیسوی کے ایک مسیحی راہب یعقوب (Jacob) نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بہت سبق آموز ہیں۔ اس نے لکھاہے کہ شاہ روس ولادیمیر کا یقین اپنے آبائی مذہب (بت پرستی) سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے تحقیق کے لیے یہودی، عیسائی اور اسلامی علمار کو بلایا۔ اور ہر ایک سے اس کے مذہب کے بارہ میں مفصل گفتگو کی (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ۱۹۸۴، تذکرہ ولادیمیر)

یعقوب کے بیان کے مطابق یہودی علمار نے کہاکہ ہمارا خدا ہم سے ناراض ہے۔ اس لیے ہم کو نہیں معلوم کہ ہمارا مقام زمین میں ہے یا آسمان میں۔ ولادیمیر نے کہاکہ مجھے ایسے مذہب کی ضرورت نہیں۔

مسلم علمار کی زبان سے اسلام کی تعلیمات سن کر اس کو اسلام سے دلچسپی ہوئی۔ حتی کہ وہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ مگر اس نے کہاکہ میں شراب کا بہت زیادہ عادی ہوں، میں اور سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں مگر میں شراب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مسلم علمار نے کہاکہ ہمارے مذہب میں شراب حرام ہے اس لیے اگر تم اسلام قبول کرتے ہو تو تم کو شراب بھی لازماً چھوڑنی پڑے گی۔ اس نے علمار سے بہت زیادہ کہاکہ شراب کے معاملہ میں اسے رخصت دیدی جائے۔ مگر علمار راضی نہیں ہوئے۔ چنانچہ بات ختم ہوگئی اور شاہ روس اسلام قبول کرنے سے باز رہا۔

اس کے بعد شاہ روس ولادیمیر نے عیسائی مذہب کے لوگوں سے گفتگو کی۔ عیسائی عالموں نے زیادہ حکمت اور دانش مندی کا ثبوت دیا وہ اگرچہ اپنے مذہب اور عقائد کے معاملہ میں بادشاہ کو زیادہ مطمئن نہ کرسکے۔ مگر انھوں نے شراب کے معاملہ میں بادشاہ کو رخصت دے دی۔

مسیحیت پر اصولی اعتبار سے مطمئن نہ ہونے کے باوجود عملی اعتبار سے اس نے اس کو پسند کرلیا۔ چنانچہ گفتگو کے آخر میں شاہ روس نے مسیحی مذہب کو اختیار کرلیا۔ پروفیسر رابرٹس کے الفاظ میں :

It was a turning-point in Russian history and culture.
J.M. Roberts, *The Pelican History of the World.*
Penguin Books Ltd., 1980, p. 355.

یہ واقعہ روس کے تاریخ اور کلچر میں ایک نقطۂ انقلاب بن گیا۔ ایک ملک جس کا مستقبل اسلام کی طرف جاسکتا تھا، اس کا مستقبل مسیحیت کی سمت میں چلا گیا۔

جن علما رنے سابق شاہ روس سے گفتگو کی، ان کو اسلام کا ایک مسئلہ معلوم تھا، مگر ان کو اسلام کا دوسرا مسئلہ معلوم نہ تھا۔ وہ حرام وحلال کے قانونی مسئلہ کو جانتے تھے مگر وہ حکمت دعوت کے زیادہ گہرے مسئلہ کو نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے وہ نادانی کی جو اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

اسلام میں بلاشبہ شراب کو حرام کیا گیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ شراب اول روز سے حرام نہ تھی۔ مکہ میں جو لوگ مسلمان ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے توحید اور رسالت کی بیعت لیتے تھے مگر شراب چھوڑنے کا حکم نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ مکہ کے اہل ایمان میں ایسے لوگ شامل تھے جو اسلام کے باوجود شراب پیتے رہے۔ انھوں نے بعد کو اس وقت شراب پینا چھوڑا جب کہ وہ ہجرت کرکے مدینہ آئے اور شراب کے بارہ میں آخری حکم نازل ہوگیا۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ کا آغاز شراب کا حکم بیان کرنے سے نہیں ہوتا اور نہ یہ ضروری ہے کہ ایمان لانے کے لیے ہر حال میں ترکِ شراب کی شرط لگائی جائے۔ ترکِ شراب اگر پہلے مرحلہ میں ممکن نظر نہ آئے تو اس کو دوسرے مرحلہ کے لیے موخر کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ شراب کے بارے میں رخصت اس وقت تک تھی جب تک اس کے بارے میں واضح حکم قرآن میں نہیں آیا تھا۔ اب جب کہ شراب کی حرمت کا واضح حکم آچکا ہے تو اب یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک حرام کی ہوئی چیز کے بارے میں کسی کو رخصت دی جائے۔ مگر یہ استدلال صحیح نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے دعوتی مصالح کے تحت بعض احکام میں لوگوں کے ساتھ وقتی طور پر نرمی اور رخصت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ اس کی ایک واضح مثال قبیلۂ ثقیف کا معاملہ ہے۔ قبیلۂ ثقیف (طائف) کا وفد رمضان ۹ھ میں مدینہ آیا اور اسلام قبول کیا۔ انھوں نے قبولِ اسلام کے لیے یہ شرط لگائی کہ وہ زکوٰۃ نہ دیں گے اور جہاد نہیں کریں گے۔ اس وقت زکوٰۃ اور جہاد کا حکم واضح طور پر قرآن میں آچکا تھا۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شرطوں کو منظور کرلیا، اور فرمایا کہ بعد کو وہ خود ہی اس پر بھی عمل کریں گے۔ اس سلسلہ میں ابوداؤد کی ایک روایت یہاں نقل کی جاتی ہے:

عن وهب، سألت جابرا عن شأن ثقيف اذ بايعت۔ قال: اشترطت على رسول الله صلى الله عليه وسلم ان لا صدقة عليها ولا جهاد، وانه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول بعد ذالك: "سيتصدقون ويجاهدون اذا اسلموا۔"

سیرۃ ابن کثیر، جلد ۴، صفحہ ۵۶

وہب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر سے ثقیف کے معاملہ میں پوچھا جب کہ انھوں نے بیعت کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ثقیف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط لگائی کہ ان پر زکوٰۃ نہ ہوگی اور نہ ان پر جہاد ہوگا۔ اور یہ کہ انھوں نے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سُنا: جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو آئندہ وہ زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔

اسلام کے مستقل احکام وہی ہیں جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔ یہ احکام بلاشبہہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر مطلوب ہیں۔ مگر مخصوص حالات میں کسی شخص کے ساتھ وقتی طور پر رخصت اور رعایت کا طریقہ اختیار کرنا بھی خود اسلام ہی کا تقاضا ہے۔

دعوت کے معاملہ میں خاص طور پر اس کا بہت زیادہ لحاظ کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں کسی شخص یا قوم کا داخلہ ایک تدریجی عمل ہے۔ حکمت دعوت اسی تدریج کو ملحوظ رکھنے کا دوسرا نام ہے۔ رسول اور اصحاب رسول نے اسی تدریج کی حکمت کو اختیار کرکے ایک عالم میں اسلام کو پھیلا دیا۔ بعد کے زمانہ میں جب مسلمان اس حکمت کو بھول گئے تو اسلام کی اشاعت کا کام بھی رک گیا۔

قومی شریعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کے زمانہ کی بابت بہت سی پیشین گوئیاں کی تھیں جو حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں ان کا ایک مجموعہ وہ ہے جن میں یہ پیشگی خبر دی گئی ہے کہ مسلمان بعد کے زمانہ میں ان طریقوں پر چلیں گے جو یہود و نصاریٰ کے طریقے ہیں۔ یعنی وہ اپنی زبان سے اسلام کا نام لیں گے مگر عملاً ان کی روش وہ ہوگی جو یہود و نصاریٰ کی روش ہے۔ اس سلسلہ کی ایک روایت یہاں نقل کی جاتی ہے :

عَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رسول اللّٰه صَلَّی اللّٰه علیه وسلم قال : لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ من کان قبلکم شِبْرًا بِشِبْرٍ وذراعًا بِذِرَاعٍ حتّٰی لو دَخَلوا جُحْرَ ضَبٍّ لَتَبِعْتُمُوْهُمْ۔ قُلْنا یارسولَ اللّٰه الیهودُ والنصاریٰ۔ قالَ فَمَنْ۔

(اخرجہ البخاری ومسلم)

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ ضرور پچھلی امتوں کے پیچھے چلو گے، بالشت بالشت اور ہاتھ ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہوں تب بھی تم ان کی پیروی کرو گے۔ ہم نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اور کون۔

قرآن میں یہود کی بہت سی "سنتیں" بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک سنت وہ ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ میں آیا ہے۔ متعلقہ آیات کا ترجمہ یہ ہے :

اور جب ہم نے تم سے یہ عہد لیا کہ تم اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے۔ اور اپنے لوگوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو۔ پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو۔ اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو، ان کے مقابلہ میں ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ۔ پھر اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر ان کو چھڑاتے ہو۔ حالاں کہ خود ان کا نکالنا تمہارے اوپر حرام تھا۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ کا انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا

ہے کہ ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن ان کو سخت عذاب میں ڈال دیا جائے۔ اور اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔ پس نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مدد پہونچے گی (البقرہ ۸۴ - ۸۶)

ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ قدیم مدینہ میں دو مشرک قبیلے آباد تھے۔ ایک کا نام اوس اور دوسرے کا نام خزرج تھا۔ دوسری طرف مدینہ اور اطراف مدینہ میں تین یہودی قبیلے تھے۔ بنو قینقاع بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ اوس اور خزرج کا حال یہ تھا کہ ان کے درمیان اکثر جنگ جاری رہتی تھی۔ گویا قدیم مدینہ میں دو مشرکانہ محاذ قائم تھے۔ ایک اوس کا محاذ، اور دوسرا خزرج کا محاذ۔ یہودی قبائل ان سے الگ نہ رہ سکے۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر قبیلۂ خزرج کے محاذ میں شامل ہو گیے۔ اور بنو قریظہ قبیلۂ اوس کے محاذ میں، ٹھیک ویسے ہی جیسے موجودہ زمانہ میں ایک مسلم ملک روس کے کیمپ میں شامل ہو جاتا ہے اور دوسرا مسلم ملک امریکہ کے کیمپ میں۔ یا جیسے ہندستان میں کچھ مسلمان کانگریس کے ساتھ مل جاتے ہیں اور کچھ مسلمان اپوزیشن کے ساتھ۔ اور پھر یہ مسلمان دو محاذوں میں بٹ کر آپس میں لڑتے ہیں۔

مدینہ کے ایک مشرک محاذ اور دوسرے مشرک محاذ کے درمیان جب جنگ چھڑتی تو یہودی قبائل کے لوگ بھی دونوں طرف سے شامل ہو جاتے۔ اس طرح ایک یہودی قبیلہ دوسرے یہودی قبیلہ کے خلاف جنگ کرتا۔ ایک یہودی دوسرے یہودی کو مارتا اور اس کو اس کی آبادی سے نکال کر جلاوطن کرتا۔ یہ فعل یہودی شریعت کے سراسر خلاف تھا۔ کیوں کہ ان کو ان کے پیغمبروں کے ذریعہ جو احکام دیے گیے ان میں واضح طور پر لکھا ہوا تھا کہ ایک یہودی پر لازم ہے کہ وہ دوسرے یہودی کے جان و مال کا احترام کرے۔ ایک یہودی دوسرے یہودی پر کوئی ظلم نہ کرے۔

آپس کی لڑائی میں یہود اپنی شریعت کے احکام کو بھول جاتے۔ مگر جب جنگ ختم ہو جاتی اور وہ دیکھتے کہ یہودیوں کی ایک تعداد گرفتار ہو کر مشرک قبائل (اوس یا خزرج) کے قبضہ میں چلی گئی ہے اور وہ ان کو قیدی بنائے ہوئے ہیں تو اس وقت ان کی غیرت قومی جاگ اٹھتی۔ اس وقت وہ اپنی شریعت کا یہ حکم لوگوں کو سنانا شروع کرتے کہ "کوئی یہودی اگر غیر یہودی کے ہاتھ گرفتار ہو جائے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑاؤ"۔ اب تقریریں ہوتیں۔ قومی چندے جمع کیے جاتے۔

یہودی قیدیوں کو مشرک قبائل سے فدیہ دے کر چھڑایا جاتا۔ اور پھر وہ فخر کے ساتھ اعلان کرتے کہ ہم نے موسوی شریعت کے فلاں حکم کے تحت ایسا کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد اول، صفحہ ۱۲۱-۱۲۰)

ان کے اس تضاد پر قرآن میں کہا گیا کہ تمہاری شریعت میں دو باتوں کا حکم تھا۔ ایک یہ کہ ایک یہودی دوسرے یہودی کو نہ مارے اور اس کو اس کے گھر سے نہ نکالے۔ تم نے بہت بڑے پیمانہ پر یہ جرم کیا اور اس وقت تم کو اپنی شریعت کا حکم یاد نہ آیا۔ تمہاری شریعت میں دوسرا حکم یہ تھا کہ یہودی غیر یہودی کے قبضہ میں چلا جائے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑاؤ۔ اس دوسرے حکم پر تم عمل کر رہے ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ تمہارا عمل حقیقۃً قومی جذبہ کے تحت ہے نہ کہ دینی جذبہ کے تحت۔ اگر اس کا محرک دینی جذبہ ہوتا تو تم دونوں جگہ دینی احکام پر عمل کرتے۔ مگر جہاں مسئلہ خالص دینی تھا وہاں تم کو دین یاد نہ آیا اور جب مسئلہ قومی غیرت کا بن گیا تو تم کو دینی حکم یاد آ رہا ہے۔ ایسا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں۔ کیوں کہ اللہ کے یہاں اندرونی جذبہ کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے نہ کہ عمل کی ظاہری صورت کی بنیاد پر۔

اس بات کو لفظ بدل کر اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ معاملہ جب اپنی قوم کے دو افراد کے درمیان ہو تو چپ رہنا، اور جب معاملہ اپنی قوم اور غیر قوم کا بن جائے تو ہنگامہ کرنا اور خطرہ کی نفسیات جگا کر پُرشور تحریکیں چلانا، اس کا نام یہودی سنت یا یہودی روش ہے۔ یہودی آپس میں ایک دوسرے سے معاملہ کرتے ہوئے شریعتِ خداوندی کو پامال کرتے تھے، مگر ان کے رہنما اس کے خلاف کوئی جوش نہ دکھاتے۔ یہ انھیں تحفظ شریعت کا مسئلہ نظر نہ آتا۔ مگر جب یہودی کے اوپر غیر یہودی کوئی ظلم کرتا تو فوراً انھیں شریعت خطرہ میں نظر آنے لگتی۔ وہ اس کے خلاف دھواں دار تحریکیں چلاتے اور اپنی اس مہم کے حق میں شریعت الٰہی کے دلائل پیش کرتے۔

بدقسمتی سے یہود کی یہ سنت آج مسلمانوں میں پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ آپس کی بے دینی اور ناانصافی کو دیکھتے ہیں مگر اس معاملہ میں وہ بالکل بے حس بنے رہتے ہیں۔ ان کی اسی بے حسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ ان کے اندر داخلی ناانصافیوں پر کوئی بڑی تحریک اٹھائی جاسکے۔ البتہ غیروں کی ناانصافی کے معاملہ میں وہ انتہائی حساس ہیں۔ چنانچہ ایسے کسی معاملہ کو لے کر صبح و شام میں ان کے درمیان ایک دھواں دار تحریک اٹھائی جاسکتی ہے۔

ہمارے جو رہنما فخر کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں مسئلہ پر لاکھوں مسلمانوں کا مجمع اکٹھا کر لیا وہ بھول جاتے ہیں کہ جس مسئلہ پر انھوں نے لاکھوں مسلمانوں کی بھیڑ جمع کی ہے وہ غیر قوم کی ناانصافی کا مسئلہ تھا۔ یہی رہنما اگر داخلی ناانصافی کے مسائل پر مسلمانوں کو پکاریں تو مجھے یقین ہے کہ انھیں ایسے پُر فخر کلمات بولنے کی خوش قسمتی حاصل نہ ہو سکے گی۔ غیر قوم کی ناانصافی کے عنوان پر اگر وہ بھرے ہوئے پنڈال میں بولنے کا موقع پا رہے ہیں تو داخلی ناانصافیوں کے نام پر کیے جانے والے جلسہ میں انھیں رہنماؤں کو یقینی طور پر خالی پنڈال میں خطاب کرنا پڑے گا۔

پچھلے پچاس برس کے اندر (مسلم لیگ سے لے کر مسلم پرسنل لا بورڈ تک) بہت سی بڑی بڑی تحریکیں مسلمانوں نے اٹھائی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے اٹھائے ہوئے گرد و غبار کے نتیجہ میں کبھی کبھی "زمیں شش شد و آسماں ہشت شد" کا منظر پیدا ہو گیا ہے۔ مگر یہ تمام تحریکیں وہ ہیں جو غیروں کی ناانصافی کے نام پر اٹھائی گئیں۔ ان میں سے کوئی ایک تحریک بھی ایسی نہیں جو مسلمانوں کی داخلی ناانصافی کے نام پر اٹھائی گئی ہو۔ حالاں کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ غیر اقوام مسلمانوں کے اوپر جو ظلم کر رہی ہیں اس سے بہت زیادہ بڑا ظلم وہ ہے جو مسلمان خود اپنے ہم قوموں پر ہر روز کرتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

ایک اسلامی ادارہ نے ایک شہر میں عمارت خریدی اور وہاں اپنی شاخ قائم کی۔ اس شاخ میں ایک مسلمان کو مقامی انچارج بنایا گیا۔ اس مسلمان نے امانت میں خیانت کی۔ اس نے خفیہ طریقہ پر ایک بوگس رجسٹری کرائی اور اس بوگس رجسٹری کے ذریعہ اس عمارت کو اپنے نام کرا لیا۔ یہ واضح طور پر غصب اور بد دیانتی کا معاملہ تھا۔ اس کا علم مسلمانوں کو اور مسلم رہنماؤں کو ہوا۔ مگر ان میں سے کوئی شخص نہ تھا جو اس معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت سمجھے۔

اس طرح کے معاملات آج ہر بستی اور ہر شہر میں پیش آ رہے ہیں۔ ایک مسلمان موقع پا کر دوسرے مسلمان کی چیز پر قبضہ کر لیتا ہے۔ مگر مسلم عوام اور مسلم رہنماؤں میں کوئی نہیں جو ان معاملات کو لے کر اٹھے۔ وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک حق دار کو اس کا حق نہ دلا لے۔ دوسری طرف انھیں عوام اور رہنماؤں کا یہ حال ہے کہ اگر انھیں اس کی اطلاع ملے کہ مسلم قوم کی عمارت پر غیر مسلم قوم کے کسی شخص نے قبضہ کر لیا ہے تو وہ فوراً اس کے خلاف متحرک ہو جاتے ہیں۔ وہ بستر مرض

سے اٹھ کر اس کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ مسلمان اور غیر مسلمان کا معاملہ ہو تو شریعت پر آنچ آنا انھیں گوارا نہیں۔ لیکن اگر معاملہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو تو انہیں کوئی بے چینی نہیں ہوتی، خواہ شریعت کے اعتبار سے وہ کتنا ہی زیادہ غلط کیوں نہ ہو۔

یہ عین وہی روش ہے جس کا الزام قرآن میں یہودیوں کو دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت پیغمبر اسلام کی پیشین گوئی کی تصدیق ہے۔ مسلمانوں کا مسلم — مسلم مسئلہ میں چپ رہنا، اور مسلم — غیر مسلم مسئلہ میں "احتجاج اور شکایت" کی مہم چلانا بلاشبہ یہودی سنت ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان اصولی دینداری کے مقام سے گر کر قومی دینداری کے مقام پر پہونچ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک جگہ متحرک ہوتے ہیں اور دوسری جگہ متحرک نہیں ہوتے۔ اگر ان کا اسلام اصولی اسلام ہوتا تو وہ دونوں جگہ یکساں طور پر متحرک ہوتے، نہ کہ صرف اس جگہ جہاں معاملہ قومی نوعیت اختیار کر لے۔

آج ہمارے عوام اور خواص دونوں یکساں طور پر اس یہودی سنت کی پیروی کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ غیر مسلم ناانصافی پر مہم چلانا اس وقت تک اللہ کی نظر میں بے قیمت ہے جب تک وہ مسلمان ناانصافی پر بھی اسی قسم کی مہم نہ چلائیں۔ کیوں کہ اللہ کے نزدیک مسلمان کے اوپر مسلمان کا ظلم بھی اتنا ہی برا ہے جتنا کہ مسلمان کے اوپر غیر مسلمان کا ظلم۔ اس قسم کی روش ان کی قومی شریعت میں خواہ کتنی ہی زیادہ اہم ہو، مگر الٰہی شریعت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

آہ یہ مسلمان

کوئی آدمی اسی وقت تک مسلمان نظر آتا ہے جب تک وہ کسی آزمائش میں نہ پڑا ہو۔ آزمائش میں پڑتے ہی ہر آدمی نامسلمان بن جاتا ہے۔ آپ جس شخص کا چاہیں جائزہ لے کر دیکھ لیں۔ آپ اس میں کوئی استثنا نہ پائیں گے

ایک شخص اپنے گھر میں سیدھی سادی زندگی گزارتا ہے۔ بظاہر وہ ایک سادہ مسلمان ہے۔ مگر جب اس کی لڑکی کی شادی آتی ہے تو اچانک وہ دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے گھر میں وہی سب ہوتا ہے جو ایک عام دنیا دار کے گھر میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی لڑکی کو تمام رسوم اور تمام جاہلی آداب کے ساتھ رخصت کر کے خوش ہوتا ہے مگر خدا کے فرشتے لکھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ ایک گھر ہے جس سے اسلام کا جنازہ نکالا گیا۔

ایک شخص لوگوں کو دیکھنے میں معقول نظر آتا ہے۔ وہ دین اور اخلاق کی باتیں کرتا ہے۔ لیکن کسی واقعہ سے اگر اس کے دل پر چوٹ پڑ جائے تو اس کے بعد اس کے معقول خول سے ایک اور انسان برآمد ہوتا ہے جو ویسا ہی نامعقول ہوتا ہے جیسا کوئی ایسا شخص جو اپنی نامعقولیت کے لیے بدنام ہو۔ دنیا کے رجسٹر میں اب بھی اس کا نام مسلمانوں کے خانہ میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر خدا کے نزدیک وہ ایسا شخص ہوتا ہے جس کا اسلام بغض اور حسد اور بے انصافی کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

ایک شخص دینی خدمت کے لیے اٹھتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی اصلاح کا کام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر اس کا ایک شاندار ادارہ بن جائے، اس کو کچھ پیسے ہاتھ آجائیں، اس کے گرد عوام کی بھیڑ اکٹھا ہو جائے، اس کو کوئی بڑا رتبہ مل جائے تو اس کے بعد وہ ایک اور ہی انسان کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اب اس کا اسلام نمائشی اسلام بن جاتا ہے۔ اس کی تواضع گھمنڈ کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ دینی خدمت کا جذبہ اپنا مقام بنانے کے شوق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقت کی نگاہ میں وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو اسلام کے راستہ پر چلا مگر وہ کچھ دور آگے بڑھا تھا کہ شیطان اس کو اچک لے گیا۔

تاریخ دعوت

مسلمان خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔ مسلمانوں کی یہی حیثیت یہ متعین کررہی ہے کہ بحیثیت امت ان کی ذمہ داری موجودہ دنیا میں کیا ہے۔ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کا وہ کام انجام دیں جس کے لیے پچھلے زمانہ میں رسول آیا کرتے تھے۔ رسول کا آنا بلاشبہ ختم ہوگیا۔ مگر رسول کا کام بلاشبہہ جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ کارِ نبوت سے کم تر درجہ کا کوئی کام ان کی حیثیتِ امت کے تحقق کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔

رسول کا کام کیا ہے۔ رسول کا کام اللہ کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہونچانا ہے۔ شرک میں مبتلا لوگوں کو توحید کا پیغام دینا ہے۔ جو لوگ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہیں، انھیں آخرت کے آنے والے دن سے باخبر کرنا ہے۔ ہر شخص کو یہ بتانا ہے کہ موجودہ دنیا میں وہ آزاد نہیں ہے کہ جو چاہے کرے۔ وہ خدا کے احکام کے ماتحت ہے۔ اسے پابند زندگی گزارنی ہے نہ کہ آزاد زندگی۔ قرآن وسنت کی صورت میں جو علمِ ربّانی محفوظ ہے اس کو تمام لوگوں تک اس طرح پہنچانا ہے کہ آخرت میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ میں اس سے بے خبر تھا۔

یہی امت مسلمہ کا اصل منصبی فریضہ ہے۔ مگر یہی وہ سب سے بڑا فریضہ ہے جس کو موجودہ زمانہ کے مسلمان سب سے زیادہ چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس چھوڑنے کی سب سے بڑی وجہ صرف ایک ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ذہن پر ان کے قومی مسائل چھائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتی مسائل ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیے ہیں۔

عرب دنیا کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے کہا کہ مسلمانوں کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ انھوں نے فوراً جواب دیا: آج کے مسلمانوں کو تو خود اپنے مسائل سے فرصت نہیں، پھر وہ دوسری قوموں میں دعوت کا کام کس طرح کرسکتے ہیں۔

مذکورہ جواب اس نفسیات کو بتاتا ہے جس کے تحت موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے عمومی

دعوت کے کام کو یکسر چھوڑ رکھا ہے۔ ان پر اپنے تحفظاتی مسائل کا غلبہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بحیثیت قوم ان کا وجود خطرہ میں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری توجہ دفاع کے محاذ پر لگا دی ہے۔ یہ فکر ان کے اوپر اتنا زیادہ چھایا کہ دعوت کی ذمہ داریوں کا احساس ان کے اندر سے نکل گیا۔ حتی کہ بہت سے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دفاعی کام ہی کو "اسلامی دعوت" کا نام دے دیا ہے۔

یہ سراسر غیر اسلامی اور غیر قرآنی ذہن ہے۔ کیوں کہ قرآن کی رو سے مسلمانوں کے تحفظ کا مسئلہ بھی خود اسی دعوتی کام سے وابستہ ہے۔ اگر وہ دعوت الی اللہ کا کام کریں تو خدا کی طرف سے ان کے قومی تحفظ کی بھی ضمانت ہے۔ اور اگر وہ دعوت الی اللہ کا کام نہ کریں تو ان کے قومی تحفظ کی بھی کوئی ضمانت نہیں۔ ماضی کی تاریخ پہلی بات کا ثبوت ہے اور مسلمانوں کی حال کی تاریخ دوسری بات کا ثبوت۔

دعوت کے ذریعہ تحفظ

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ۔ واللہ یعصمک من الناس ان اللہ لایھدی القوم الکفرین (المائدہ ۶۷)

اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہونچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔

اس آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں کئی روایتیں حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں آئی ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب مجھ کو اپنے پیغام کے ساتھ بھیجا تو میں نے اپنے اندر اس کے لیے تنگی محسوس کی۔ اور مجھے خیال ہوا کہ لوگوں میں ایسے ہیں جو مجھے جھٹلائیں گے۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت اتاری۔ اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہریداری کی جاتی تھی۔ حتی کہ یہ آیت اتری۔ اس وقت رسول اللہؐ نے اپنے حجرہ سے سر نکالا اور فرمایا کہ اے لوگو واپس جاؤ۔ کیوں کہ اللہ نے مجھ کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے (صفوۃ التفاسیر، المجلد الاول، صفحہ ۳۵۵)

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ رسول کے لیے حفاظت کا مسئلہ ہو تو اس کا الگ سے مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں، دعوت کا عمل ہی اس کی حفاظت کا بھی ضامن ہے۔ اللہ کا یہ وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصلاً تھا اور آپ کی امّت کے لیے یہ وعدہ تبعاً ہے۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جس کی روشنی میں ہمیں اپنے معاملات کو دیکھنا چاہیے۔ دوسری اقوام کی طرف سے جب بھی اہل اسلام کے لیے حفاظت کا مسئلہ پیدا ہو تو اس کا سبب یہی ہوگا کہ امت نے دعوت الی اللہ کے فریضہ کو چھوڑ دیا ہے۔ اور جب امت دعوت الی اللہ کے فریضہ کے لیے اٹھے تو اس کو یقین رکھنا چاہیے کہ بقیہ تمام خطرات اور اندیشے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی ضمانت ہے۔ بقیہ خطرات کے لیے الگ سے مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ دعوت الی اللہ کا کام کیجئے، اور بقیہ تمام خطرات کے دفعیہ کی صورتیں اپنے آپ پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔

دعوت سے یہاں مراد غیر مسلموں میں دعوت ہے۔ یعنی اللہ کے پیغام کو اللہ کے ان بندوں تک پہونچانا جو ابھی اللہ کے حلقۂ اطاعت میں داخل نہیں ہوئے۔ قرآن میں دعوت یا تبلیغ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے غیر مسلموں ہی میں دعوت پہونچانے کے لیے آیا ہے۔ مسلمانوں کے اندر جو کام کرنا ہے اس کے لیے قرآن میں تذکیر، اصلاح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ مسلمانوں کی دینی اصلاح کے کام کو مجازی طور پر دعوت اور تبلیغ کہا جاسکتا ہے، مگر دعوت اور تبلیغ کا لفظ اصلاً جس دینی کام کا عنوان ہے وہ غیر مسلم اقوام تک خدا کا پیغام پہونچانا ہے نہ کہ مسلمانوں کی داخلی اصلاح کرنا۔

قرآن میں حضرت موسیٰ کے زمانہ کے ایک "رجل مومن" کا ذکر ہے۔ یہ فرعون کے دربار کا ایک شخص تھا جو اپنے ایمان کو بربنائے مصلحت چھپائے ہوئے تھا۔ مگر ایک وقت آیا جب کہ فرعون نے اپنے اس فیصلہ کا اعلان کیا کہ وہ حضرت موسیٰ کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔ اس وقت یہ رجل مومن خاموشی کو برداشت نہ کرسکا۔ وہ حضرت موسیٰ کی حمایت میں بول پڑا اور فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے ایک پوری دعوتی تقریر کر ڈالی۔

یہ ایک بے حد نازک معاملہ تھا۔ کیوں کہ فرعون نے جب حضرت موسیٰ کے ساتھ اپنی دشمنی

پوری طرح ظاہر کر دی تو اس کے بعد یقینی تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کی حمایت کرنے والے کے ساتھ بھی وہی برا معاملہ کرے گا جو وہ خود حضرت موسیٰ کے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ مگر رجل مومن نے تبلیغ حق کو دوسرے ہر پہلو پر ترجیح دی اور نہایت کھلے طور پر سچائی کا اعلان کیا۔

قرآن میں رجل مومن کی مفصل تقریر نقل کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے:

فوقٰه الله سیآت ما مکروا وحاق بآل فرعون سوء العذاب۔	پھر اللہ نے اس کو ان لوگوں کی بری تدبیروں سے بچالیا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کو برے عذاب نے گھیر لیا۔
المومن ۴۵	

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رجل مومن کو جو چیز "سیئات ما مکروا" سے بچانے والی ثابت ہوئی وہ دعوت حق تھی۔ رجل مومن کے پاس صرف حق کی معرفت اور اس کی دعوت کا سرمایہ تھا۔ اس کے مقابلہ میں فرعون کے پاس ہر قسم کی مادی طاقتیں تھیں۔ مگر رجل مومن جب داعی بن کر کھڑا ہو گیا تو خدا کی حمایت اس کے ساتھ ہو گئی۔ فرعون اپنی ساری طاقتوں کے باوجود اس کے خلاف اپنے برے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

دعوت الی اللہ کے کام پر عصمت و حفاظت کا خدائی وعدہ بلاشبہ یقینی ہے۔ مگر اس وعدہ کی تکمیل حقیقی دعوت ہی کے کام پر ہو سکتی ہے نہ کہ کسی اور کام پر۔ اگر ہم کوئی اور کام کریں اور اس کو "دعوت الی اللہ" کا عنوان دیدیں تو ہمیں ہرگز یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ خدا کا وعدۂ حفاظت ہمارے حق میں پورا ہوگا۔

تاریخ کی تصدیق

تاریخ حیرت انگیز طور پر اس قرآنی بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ دور اول سے لے کر بعد کے زمانہ تک بار بار یہ واقعہ ہوا ہے کہ غیر مسلموں کی طرف سے اہل اسلام کے لیے حفاظت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اور ہر بار جس چیز نے اس مسئلہ کو حل کیا وہ دعوت الی اللہ ہی کی طاقت تھی۔

دعوت کے ذریعہ حفاظت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اگر ایسا ہو کہ اہل اسلام خدا کی بات کو پوری طرح پہونچا دیں۔ اس کے باوجود مخاطب انکار اور سرکشی کا رویہ اختیار کرے تو اس وقت یہ معاملہ براہ راست خدا کا معاملہ بن جاتا ہے۔ خدا کی طرف سے خصوصی مدد آتی ہے جو اہل حق

کو غالب اور ان کے دشمنوں کو مغلوب کر دیتی ہے۔ حضرت ہود اور حضرت لوط کے واقعات اسی کی مثالیں ہیں۔

خدا کا دین ہر آدمی کی خود اپنی فطرت کی آواز ہے۔ دین حق کی دعوت دینا گویا آدمی کے دل کے دروازے پر دستک دینا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کے اندر اگر کچھ بھی سنجیدگی ہو تو اس کا دل فطرت کی پکار کے آگے جھک جاتا ہے۔ اگر وہ باقاعدہ طور پر اس کو قبول نہ کرے تب بھی اس کے دل میں ایسے لوگوں کے حق میں نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے جو خود اس کے دل کی دھڑکنوں کی زبان میں کلام کر رہے ہوں۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کم از کم انسانی اور اخلاقی سطح پر اسے ان لوگوں کی مدد کرنا چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اسی نوعیت کی ایک مثال ہے۔

تیسری شکل وہ ہے جس کو انتہائی شکل کہا جا سکتا ہے۔ یعنی مخاطب کا داعی کی بات سے اس حد تک متاثر ہونا کہ وہ اس پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو جائے۔ یہ آخری صورت بھی تاریخ میں بار بار پیش آئی ہے اور جہاں یہ صورت پیش آجائے وہاں ہر قسم کا مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی تیسری صورت پیش آئی۔ آپ کے ساتھ پیش آنے والی صورت اس نوعیت کی آخری کامل ترین مثال تھی۔

ایک اعتراف

ٹامس کارلائل (۱۸۸۱-۱۷۹۵) نے اسلامی دعوت کی تسخیری قوت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

یہ بات بہت کہی گئی ہے کہ محمد نے اپنا مذہب تلوار کے ذریعہ پھیلایا۔ تلوار یقیناً، مگر آپ تلوار کہاں سے لائیں گے۔ ہر نیا فکر اپنے آغاز میں لازمی طور پر ایک کی اقلیت میں ہوتا ہے۔ وہ ابتداءً صرف ایک انسان کے دماغ میں آتا ہے۔ ساری دنیا میں صرف ایک آدمی اس کو ماننے والا ہوتا ہے۔ تمام آدمیوں کے مقابلہ میں صرف ایک آدمی۔ ایسی حالت میں اگر وہ ایک تلوار لے اور اس کے ذریعہ سے اپنے عقیدہ کو پھیلانے کی کوشش کرے تو اس کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

Much has been said of Mahomet's propagating his religion by the sword. The sword indeed; but where will you get your sword. Every new opinion, at its starting, is precisely in a minority of one. In one man's head alone, there it dwells as yet. One man alone of the whole world believes it; there is one man against all men. That he take a sword, and try to propagate with that, will do little for him.
Thomas Carlyle, *The Hero As Prophet*, p. 23.

اگلے صفحات میں ہم اسلامی تاریخ کے کچھ حوالے نقل کریں گے جس سے دعوت کی تسخیری حیثیت کا واقعاتی ثبوت ملتا ہے۔

تدبیر انسانی، تدبیر ربانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تقریباً تیرہ سال رہے۔ مکہ کے قیام کے آخری زمانہ میں مشرکین نے یہ منصوبہ بنایا کہ آپ کے مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ان کے سرداروں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے:

واذ یمکر بك الذین کفروا لیثبتوك او یقتلوك او یخرجوك ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین
(الانفال ۳۰)

اور جب منکرین تمہاری نسبت تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیریں کر رہا تھا۔ اور اللہ بہترین تدبیر والا ہے۔

پیغمبر اسلام کے بارہ میں مشرکین کا منصوبہ یہ تھا کہ آپ کو قید یا قتل یا اخراج کے ذریعہ اپنے میدان سے ہٹا دیں۔ آیت کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیادہ بہتر تدبیر کے ذریعہ اس ظالمانہ منصوبہ کو ناکام بنا دیا۔ یہ خدائی منصوبہ کیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ منصوبہ یہ تھا کہ عین اس زمانہ میں جب کہ مکہ میں آپ کے خاتمہ کی تدبیریں کی جا رہی تھیں، مکہ کے دو مسلمان مدینہ بھیجے گیے اور وہاں انھوں نے اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ ان کی تبلیغ سے مدینہ میں کثرت سے لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مدینہ میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں ہو گیے کہ انھوں نے مدینہ میں غالب حیثیت حاصل کر لی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

خاموشی کے ساتھ مکہ سے مدینہ منتقل ہو گیے۔ یہی بات ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: امرت بقریۃ تاکل القری (مجھے ایک ایسی بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی) بخاری و مسلم۔

یہ آیت واضح طور پر تدبیر انسانی اور تدبیر ربانی کا فرق بتا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر انسانی قید اور قتل اور اخراج کی سطح پر چلتی ہے، اور تدبیر ربانی دعوت کے ذریعہ تسخیر قلوب کی سطح پر۔ انسان کی سوچ کی آخری حد یہ ہے کہ وہ اپنے حریف کو محبوس کرکے اس کی سرگرمیوں کو روک دے۔ یا اس کو اپنے علاقہ سے نکال دے یا اس کو قتل کرکے اس کا خاتمہ کر ڈالے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا طریقہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے دین کا مبلغ بنا کر بستیوں میں داخل کرتا ہے۔ وہ اپنے پیغام کے لیے لوگوں کے دلوں کے دروازے کھولتا ہے۔ اس طرح یہ ہوتا ہے کہ تمام زندہ لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر دین حق کی جانب اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ دین حق کی طاقت اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ دشمنوں کی کوئی تدبیر ان کے اوپر کارگر نہ ہو سکے۔

تسخیری کلمہ

ابو طالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو قریش کے سردار ان کے پاس جمع ہوئے اور کہا کہ "ہمارے اور محمد کے درمیان کوئی بات طے کر دیجیے" تاکہ دونوں ایک دوسرے سے رُکے رہیں"۔ ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا کہ یہ قریش کے سردار لوگ جمع ہیں بتائیے کہ آپ ان سے کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

نعم، کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم (سیرۃ ابن کثیر)	ہاں، تم مجھے ایک کلمہ دیدو، تم اس کے ذریعہ سے عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم اس کے ذریعہ سے تمہارے لیے جھک جائیں گے۔

انھوں نے پوچھا کہ وہ کلمہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم کہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اس کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو ان کو چھوڑ دو (تقولون: لا الہ الا اللہ وتخلعون ما تعبدون

من دونه)

آپ جب مکہ میں حق کا پیغام لے کر اٹھے تو آپ ایک فی دنیا کی اقلیت رکھتے تھے۔ مگر بہت جلد عرب کے ذہین اور صالح افراد کو آپ کے کلمہ (بالفاظ دیگر آپ کے فکر کی طاقت) نے کھینچ لیا۔ اگرچہ ابتداءً آپ کی شدید مخالفت کی گئی۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ سنجیدہ اور صاحب فکر افراد کے لیے آپ کا پیغام اپنے اندر مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔

مکہ کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ طفیل بن عمرو الدوسی کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ آئے۔ وہ اپنے قبیلہ کے معزز آدمی تھے۔ قریش کے کچھ لوگ ان سے ملے اور کہا کہ یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ایک جادوگر آدمی ہیں۔ تم ان کی بات نہ سننا اور ان سے دور رہنا۔ طفیل بن عمرو کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں ہیں۔ چنانچہ وہ وہاں گیے تو اپنے کانوں میں روئی ڈال لی تاکہ آپ کی آواز نہ سن سکیں۔

بعد کو انھیں خیال آیا کہ میں خود ایک سمجھ دار آدمی ہوں۔ مجھے کان میں روئی ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے محمد کا کلام سننا چاہیے۔ آخر میں کیوں ڈروں کہ میں ان کا کلام سن کر بھٹک جاؤں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا اور پورا قصہ انھیں بتایا۔ پھر کہا کہ آپ مجھے اپنا کلام سنائیے۔ آپ نے طفیل بن عمرو کو قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم وہ اتنا اچھا کلام تھا کہ اتنا اچھا کلام میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ ایسا منصفانہ امر تھا کہ ویسے منصفانہ امر سے میں ابھی تک واقف نہیں ہوا تھا (فلا واللہ ما سمعت قولاً قط احسن منہ ولا امراً اعدل منہ) اس کے بعد طفیل بن عمرو اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گیے۔

ہجرت حبشہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب کام شروع کیا، اس وقت وہاں شرک چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ مکہ کے لوگوں نے آپ کی مخالفت شروع کر دی۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کو طرح طرح سے ستایا جاتا۔ نبوت کے پانچویں سال آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ تم لوگ مکہ چھوڑ کر حبش چلے جاؤ۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے دو بار حبش کی جانب ہجرت کی۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد تقریباً ۱۲۰ ہے۔

مکہ کے مشرکین کو جب یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ کے ساتھی حبش چلے گیے ہیں اور وہاں اطمینان کے ساتھ رہ رہے ہیں تو انھوں نے مشورہ کرکے اپنے دو آدمیوں (عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ) کو حبش کے بادشاہ نجاشی کے پاس بھیجا۔ انھوں نے وہاں جاکر شاہ نجاشی اور اس کے درباریوں کو تحفے پیش کیے اور کہا کہ ہمارے شہر کے کچھ نادان لوگ اپنا آبائی دین چھوڑ کر تمہارے یہاں آگیے ہیں۔ ان کو ہمارے حوالے کر دو کہ ہم انھیں اپنے ساتھ واپس لے جائیں۔

یہ ایک طویل قصہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ نجاشی کے درباری مشرکین مکہ کے وفد کی باتوں سے متاثر ہوگیے اور انھوں نے شاہ سے یہ سفارش کی کہ مسلمانوں کو دوبارہ مکہ واپس بھیج دیا جائے۔ یہ ایک بے حد نازک لمحہ تھا۔ کیوں کہ واپسی کا مطلب بھیڑیوں کے منھ میں واپس جانا تھا۔ مگر اس نازک لمحہ میں جو چیز مسلمانوں کے کام آئی وہ وہی "دعوت" تھی جس کو یہ بے سروسامان لوگ اپنے ساتھ لے کر وہاں گیے تھے۔

چنانچہ آخری مرحلہ میں یہ طے ہوا کہ مسلمان نجاشی کے دربار میں حاضر ہوں اور بتائیں کہ وہ دین کیا ہے جو انھیں پیغمبر عربی سے ملا ہے۔ اس وقت حضرت جعفر بن ابی طالب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے دربار میں ایک تقریر کی جو سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اس کے بعد حضرت جعفر نے قرآن سے سورہ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا۔ روایات بتاتی ہیں کہ اس کو سن کر بادشاہ اور اس کے درباریوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ حتی کہ بادشاہ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ اس کے بعد شاہ نجاشی نے حکم دیا کہ مشرکین مکہ کا وفد جو تحفے لایا تھا وہ اُسے واپس کر دیا جائے۔ اس نے مسلمانوں کو عزت کے ساتھ اپنے دربار سے رخصت کیا۔ ان کو امان دی اور مشرکین کے دونوں آدمی ذلیل ہو کر وہاں سے نکلے اور مسلمان وہاں اچھے مقام اور اچھے پڑوس میں ٹھہرے رہے (وردّ المسلمين ردًّا كريما وانّهم وخرجا (عبد الله بن ابى ربيعة وعمرو بن العاص) من عنده مقبوحين۔ فاقام المسلمون بخير دار مع خير جار)

اسلام عمر بن الخطاب

نبوت کے چھٹے سال تک مکہ کی ایک قابلِ لحاظ تعداد اسلام کے حلقہ میں داخل ہوچکی تھی مگر یہ لوگ زیادہ تر نیچے کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے مکہ میں ابھی تک اسلام کا دبدبہ

قائم نہیں ہوسکا تھا۔ یہ دروازہ بھی پہلی بار دعوت ہی کے ذریعہ سے کھلا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دعا فرمائی کہ اے اللہ عمر بن الخطاب یا عمرو بن ہشام کے ذریعہ اسلام کو طاقت دے۔ (اللّٰھم اعز الاسلام باحد العمرین) اس کے بعد حالات بڑھتے رہے یہاں تک کہ مکہ کے سردار ابوجہل نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص محمد کو قتل کر ڈالے اس کو میں سو اونٹ دوں گا۔ عمر بن خطاب مکہ کے نہایت طاقتور اور پہلوان قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے تلوار ہاتھ میں لی اور اس ارادہ سے گھر سے روانہ ہوئے کہ رسول اللہ کو قتل کرکے ایک سو اونٹ حاصل کریں۔

وہ جا رہے تھے کہ راستہ میں یہ معلوم ہوا کہ ان کی بہن فاطمہ بنت خطاب اور ان کے بہنوئی سعید بن زید دونوں اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوگئے ہیں۔ عمر کو یہ سن کر غصہ آگیا۔ وہ اپنی بہن کے گھر پہونچے اور بہن اور بہنوئی کو مارنا شروع کیا۔ بہن نے کہا کہ اے خطاب کے بیٹے، تم جو کچھ کرسکتے ہو کرو، ہم تو اب اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اس کے بعد عمر کچھ نرم پڑے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ وہ دین کیا ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے۔ انھوں نے ایک صحیفہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا جس میں قرآن کی سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ عمر نے اس کو پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ ان کی زبان سے نکلا: ما احسن ھٰذا الکلام واکرمہ (کیسا اچھا اور برتر یہ کلام ہے)

خلاصہ یہ کہ اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔ حضرت عمر اپنے زمانہ میں مکہ کے نہایت طاقتور آدمی تھے۔ ان کا قد اتنا بلند تھا کہ مسجد نبوی (مدینہ) بننے کے بعد جب وہ اس میں داخل ہوئے تو ان کا سر دروازہ سے ٹکرا گیا۔ ایسے شخص کا اسلام کے حلقہ میں داخل ہونا بلاشبہ اسلام کی عظیم الشان مدد تھی۔ اور اسلام کو یہ عظیم الشان مدد دعوت کے راستہ سے حاصل ہوئی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ عمر کا اسلام ایک فتح تھا۔ ہم کعبہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے یہاں تک کہ عمر نے اسلام قبول کیا۔ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو انھوں نے مشرکین مکہ سے لڑائی کی یہاں تک کہ انھوں نے خود بھی کعبہ کے پاس نماز پڑھی اور ہم نے بھی ان کے ساتھ نماز پڑھی

(انّ اسلام عمر کان فتحًا ولقد کنّا ما نصلّی عند الکعبة حتی اسلم عمر فلما اسلم قاتل قریشًا حتی صلّی عند الکعبة وصلینا معہ)

قبائل یثرب کا قبول اسلام

اسلام ایک فطری دین ہے۔ وہ ہر آدمی کے دل کے دروازہ پر دستک دیتا ہے۔ اگر کوئی نفسیاتی رکاوٹ حائل نہ ہو تو آدمی اس کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے اور اس کی صداقت کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس کی ایک تاریخی مثال مدینہ کے انصار (اوس اور خزرج) کا معاملہ ہے۔

مکی دور میں مدینہ سے ایک صاحب زیارت کعبہ کے لیے مکہ آئے۔ ان کا نام سُوَید بن الصامت تھا۔ وہ نہایت باصلاحیت آدمی تھے۔ چنانچہ ان کی قوم ان کو الکامل کہتی تھی۔ مکہ میں ان کی ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ آپ نے ان کو اسلام کی دعوت پیش کی۔ سُوید نے کہا کہ آپ کے پاس شاید اسی قسم کی چیز ہے جو میرے پاس ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکمتِ لقمان۔ آپ نے کہا کہ اس کو میرے سامنے پیش کرو۔ انھوں نے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اچھا کلام ہے۔ مگر میرے پاس قرآن ہے جو اس سے بھی زیادہ بہتر ہے۔ پھر آپ نے قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر انھیں سنایا۔ سُوید بن الصامت نے اس کو سن کر کہا: ان ھذا القول حسن (بے شک یہ بہتر کلام ہے)

اس کے بعد ابوالحیسر انس بن رافع مکہ آئے۔ ان کے ساتھ قبیلہ اوس کے چند اور افراد تھے۔ اس وقت اوس اور خزرج میں لڑائی چل رہی تھی۔ اور یہ لوگ خزرج کے مقابلہ میں قریش کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مکہ آئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی بابت سنا تو آپ ان کے پاس آئے۔ اور ان سے کہا کہ جس چیز کے لیے تم آئے ہو کیا اس سے بہتر چیز کی طرف تمہیں رغبت ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیا چیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر انھیں سنایا۔ اس کے بعد مدینہ کے وفد کے ایک نوجوان ایاس بن معاذ نے کہا۔ اے قوم، خدا کی قسم یہ اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم

آئے ہو (ای قوم ھذا واللہ خیر مما جئتم لہ) تاہم اس وقت انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور مدینہ واپس چلے گیے۔

اس کے بعد زیارت کعبہ کا زمانہ آیا اور عرب کے مختلف قبیلے مکہ آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکل کر ان قبائل کے پاس گیے اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی۔ اس سلسلہ میں عقبہ کے پاس آپ کی ملاقات قبیلہ خزرج (مدینہ) کے چھ آدمیوں سے ہوئی۔ جس میں اسعد بن زرارہ اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ ابتدائی گفتگو کے بعد آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ یہ لوگ مدینہ کے یہود سے یہ سنتے آئے تھے کہ ایک آخری نبی آنے والے ہیں ان کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ خزرج کے لوگوں نے آپ کا پیغام سن کر پہچان لیا کہ یہ وہی نبی ہیں۔ انھوں نے آپس میں کہا کہ اے قوم، خدا کی قسم یہی وہ پیغمبر ہیں جن کے بارے میں یہود تمہیں بتا رہے تھے۔ تو یہود اس کے بارے میں تم پر سبقت نہ کرنے پائیں۔ چنانچہ انھوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہی اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ قال بعضھم لبعض یا قوم تعلمون واللہ انہ النبی الذی توعدکم بہ الیہود فلا تسبقنکم الیہ فاجابوہ وصدقوہ واسلموا۔

مدینہ میں اسلام کی اشاعت

یہ لوگ اسلام کے بعد مدینہ واپس ہوئے اور وہاں کے لوگوں کو اسلام سے متعارف کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ہر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اگلے سال موسم حج میں دوبارہ مدینہ کے ۱۲ آدمی مکہ آئے۔ یہ لوگ اسلام سے متاثر ہو چکے تھے۔ انھوں نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت اسلام قبول کرنے کے ساتھ آپ کی حمایت کرنے کی بیعت بھی تھی۔ چنانچہ اس کو بیعت النساء کہا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا نام تاریخ اسلام میں بیعت عقبہ اولیٰ ہے۔

یہ لوگ مدینہ واپس ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر کو بھیج دیا تاکہ وہ مدینہ کے لوگوں کو اسلام سے متعارف کریں اور قرآن سنائیں اسی لیے ان کو مدینہ میں مُقری (پڑھ کر سنانے والا) کہا جاتا تھا۔

اس وقت مدینہ کے ایک نمایاں سردار اُسید بن حُضیر تھے۔ ان کو مدینہ میں اسلام کی اشاعت کی خبر ہوئی تو وہ اس پر غصہ ہوگیے۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ مکہ کے کچھ لوگ یہاں آکر ہمارے کم سمجھ لوگوں کو بہکا رہے ہیں اور ان کے آبائی دین سے انھیں پھیر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے گھر سے ہتھیار لے کر نکلے تاکہ ایسے لوگوں کو مار کر بھگا دیں۔

ان کی ملاقات ایک باغ میں مصعب بن عمیر سے ہوئی جو کچھ لوگوں کو اسلام کی باتیں بتا رہے تھے۔ اُسید بن حُضیر نے انھیں بُرا بھلا کہا اور کہا کہ تم یہاں اس لیے آئے ہو کہ ہمارے کمزور لوگوں کو ان کے دین سے پھیرو۔ مصعب بن عمیر نے کہا کہ آپ بیٹھئے اور ہماری بات سنیے۔ اگر وہ صحیح ہو تو اس کو مان لیجئے، اور اگر صحیح نہ ہو تو اسے رد کر دیجئے۔ اُسید بن حضیر نے کہا کہ تم نے انصاف کی بات کہی (انصفت)

اس کے بعد وہ اپنا ہتھیار الگ رکھ کر بیٹھ گیے۔ مصعب بن عمیر نے ان کے سامنے قرآن کی آیتیں پڑھیں۔ اس کو سُن کر اُسید بن حضیر کا ذہن بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتنا اچھا اور کتنا حسین کلام ہے (ما احسن هذا و اجمله) اس کے بعد انھوں نے غسل کر کے اپنے کو پاک کیا اور کلمۂ شہادت ادا کر کے اسلام میں داخل ہوگیے۔

تقریباً یہی واقعہ مدینہ کے دوسرے بڑے سردار سعد بن معاذ کے ساتھ پیش آیا۔ ان کو مدینہ میں اسلام کی اشاعت کی خبر ہوئی۔ ابتداءً وہ بھی غصہ ہوئے۔ اور اپنا ہتھیار لے کر نکلے تاکہ ایسے لوگوں کو تنبیہہ کر دیں۔ وہ مصعب بن عمیر کے پاس پہونچے تو انھوں نے کہا کہ آپ پہلے میری بات سنیے اس کے بعد کوئی فیصلہ کیجیے۔ اس کے بعد انھوں نے سعد بن معاذ کو قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ راوی کہتے ہیں کہ قرآن کو سنتے ہی ہم نے ان کے چہرے پر اسلام کی جھلک دیکھی۔ (فعرفنا واللہ فی وجهه الاسلام) اس کے بعد انھوں نے پوچھا کہ اس دین میں داخل ہونے کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے۔ مصعب بن عمیر نے کہا کہ آپ غسل کیجیے اور اپنے کپڑوں کو پاک کیجیے اس کے بعد حق کی گواہی دیجیے پھر دو رکعت نماز پڑھیے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور اسلام میں داخل ہوگیے۔

اس کے بعد دونوں سردار سعد بن معاذ اور اُسید بن حُضیر اپنے قبیلہ کی طرف واپس آئے

اور لوگوں سے کہا کہ میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہمارے بہترین شخص ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تمہارے مردوں اور عورتوں سے بولنا میرے لیے اس وقت تک حرام ہے جب تک تم اللہ اور رسول پر ایمان نہ لاؤ۔ چنانچہ اسی دن شام تک ان کے قبیلہ کے تمام مرد اور عورت مسلمان ہوگیے۔

مدینہ کے قبائل اپنی سادہ فطرت پر تھے۔ ان کے اندر سلامت طبع کمال درجہ میں موجود تھی۔ وہ حق کو جان لینے کے بعد اس سے اعراض کرنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ مدینہ کے قبائل میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ یہاں تک کہ انصار کے گھروں میں سے کوئی گھر نہ رہا جس میں کچھ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں موجود نہ ہوں۔

اس کے بعد حضرت مصعب بن عمیرؓ مکہ واپس آئے۔ ان کے ساتھ ستر مرد اور دو عورتیں تھیں۔ یہ لوگ حج سے فارغ ہوئے تو قرار داد کے مطابق ایک روز رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی جس کو بیعت عقبہ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ کافی تفصیل کے ساتھ سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ آخری مرحلہ میں جب آپ ان لوگوں سے بیعت لے رہے تھے تو ان میں سے ایک شخص (عباس بن عبادہ بن نضلہ) نے کہا کہ اے لوگو، تم جانتے ہو کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ عرب و عجم کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اگر ہم نے بیعت کا حق ادا کر دیا تو ہمارے لیے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جنّت۔ انھوں نے کہا کہ ہاتھ بڑھائیے۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور انھوں نے بیعت کی (قالوا فما لنا بذالك یارسول اللہ ان نحن وافینا قال الجنة۔ قالوا ابسط یدك فبسط یده فبایعوه) التفسیر المظہری، الجلد الثانی، صفحہ ۱۲-۱۰۷

ہجرت حبشہ

قدیم عرب میں آدمی قبیلہ کی حمایت میں زندگی گزارتا تھا۔ قبیلہ اس کی جان و مال کی حفاظت کا ضامن ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو ہاشم کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے سردار اس وقت ابو طالب بن عبد المطلب تھے۔ نبوت کے دسویں سال ابو طالب کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد قبیلہ کے رواج کے مطابق سرداری کا عہدہ ابولہب کو ملا۔ ابولہب نے آپ کو اپنی حمایت

میں لینے سے انکار کر دیا۔

یہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ تھا۔ کیوں کہ قبیلہ کی حمایت سے محرومی کا مطلب یہ تھا کہ آدمی کی جان و مال دوسروں کی نظر میں مباح ہو جائے۔ چنانچہ اس کے بعد آپ کے مخالفین آپ کے اوپر جری ہو گیے۔ سیرت کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ ابو طالب کی زندگی تک قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہ کر سکے۔ مگر جب ابو طالب کی وفات ہو گئی تو وہ آپ کے خلاف جارحیت کرنے لگے یہاں تک کہ قریش کے بعض نادانوں نے آپ کے سر پر مٹی ڈال دی۔

مکہ میں قیام بظاہر اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔ عین اس وقت دعوت کے ذریعہ ایک نیا شاندار امکان آپ کے لیے نکل آیا۔ نبوت کے گیارہویں سال مدینہ کے چند آدمی کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ آئے اور آپ کے پیغام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد اگلے سال مزید کچھ لوگ آئے۔ انھوں نے آپ کی زبان سے قرآن سنا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو گیے۔ یہ لوگ جب واپس ہونے لگے تو ان کے ساتھ مکہ سے دو آدمی (عبداللہ بن ام مکتوم اور مصعب بن عمیر) قرآن اور اسلام کی تعلیم کے لیے بھیجے گیے۔ مدینہ پہونچ کر انھوں نے لوگوں کو قرآن سنانا شروع کیا۔ اور اسلام کی تعلیم سے لوگوں کو آگاہ کرنے لگے۔ مدینہ کی زمین اسلام کی دعوت کے لیے نہایت زرخیز ثابت ہوئی۔ وہاں کے لوگ تیزی سے اسلام قبول کرنے لگے۔ حتی کہ یہ نوبت آگئی کہ اسلام مدینہ کے تمام محلوں میں پھیل گیا۔ انصار مدینہ کے گھروں میں سے کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں کچھ مرد اور کچھ عورت مسلمان نہ ہو گیے ہوں (وجعل الاسلام یفشو فی منازل الانصار حتی لم تبق دار من دور الانصار الا وفیها رجال و نساء مسلمون)

مدینہ کی فضا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے موافق دیکھا تو آپ نے مکہ کے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ خاموشی کے ساتھ مدینہ چلے جائیں۔ چنانچہ وہ لوگ ہجرت کرکے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت مکہ سے مدینہ منتقل ہو گئی۔ مکہ کے مشرکین نے اس صورتِ حال کو اپنے خلاف ایک چیلنج سمجھا۔ انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ لوگ مدینہ کو اپنا مرکز بنا کر دوبارہ ہمارے

خلاف کارروائی کریں گے۔ انھوں نے طے کیا کہ قبل اس کے کہ مدینہ کے مسلمان کوئی کارروائی کریں پیغمبر اسلام کو قتل کر دیا جائے۔ مگر اب معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ جس رات کو وہ آپ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے تھے عین اسی رات کو آپ مکہ سے نکل کر مدینہ پہونچ گئے۔

اس کے بعد مدینہ میں اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہوئی اور اس نئی تاریخ کا دروازہ جس چیز نے کھولا وہ بلاشبہ دعوت تھی۔

حدیبیہ کے بعد اشاعت اسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً ۱۳ سال مکہ میں رہے۔ اس کے بعد آپ مکہ والوں کی شدید مخالفت کی بنا پر مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ مگر مکہ کے مشرکین کا غصہ اب بھی ختم نہ ہوا۔ انھوں نے سمجھا کہ اگر انھوں نے مسلمانوں کو اسی طرح چھوڑ دیا تو وہ طاقت ور ہو جائیں گے اور ایک روز مکہ پر حملہ کر دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے خود پہل کر کے اہلِ اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ بدر و اُحد جیسی کچھ بڑی جنگیں ہوئیں اور زیادہ تر چھوٹے مقابلے ہوئے جن کو جھڑپ کہا جا سکتا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً ۸۰ تک پہونچتی ہے۔

ایک کے بعد ایک جنگیں ہوتی رہیں۔ مگر اہل شرک اور اہل توحید کے درمیان فیصلہ نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گہرا دعوتی منصوبہ بنایا۔ یہ دعوتی منصوبہ وہی ہے جس کو اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ (۶ھ) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی تفصیلات حدیث کی تمام کتابوں میں مذکور ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مختلف واقعات کے بعد وہ مرحلہ آیا جب کہ مقام حدیبیہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش کش کی کہ آپ کے اور مشرکین کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ (No-war pact) ہو جائے۔ مشرکین مکہ سے اس موضوع پر گفت گو شروع ہوئی تو انھوں نے اس ناجنگ معاہدہ پر راضی ہونے کے لیے بالکل یک طرفہ قسم کی شرطیں پیش کیں۔ مثلاً یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب عمرہ کیے بغیر مقام حدیبیہ سے مدینہ واپس چلے جائیں۔ قریش کا کوئی آدمی مسلمانوں کے یہاں چلا جائے تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ اس کے برعکس کوئی مسلمان مدینہ

سے مکہ چلا جائے تو مکہ کے لوگ اسے واپس نہیں کریں گے۔ مشرکین مکہ کی ضد یہاں تک بڑھی کہ جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو انھوں نے معاہدہ کی عبارت میں محمد رسول اللہ لکھنے نہیں دیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ محمد بن عبد اللہ لکھا جائے۔ اسی طرح انھوں نے اور بھی بہت سی اشتعال انگیز باتیں کیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یک طرفہ طور پر ان کی تمام اشتعال انگیزیوں کو برداشت کر لیا۔ اور مشرکین مکہ کی اپنی شرائط پر دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر کے حدیبیہ سے واپس آگیے۔

مشرکین کی شرائط کو یک طرفہ طور پر مان کر یہ معاہدہ اسی لیے کیا گیا تھا کہ دعوت کا دروازہ کھلے۔ چنانچہ اس معاہدے کے بعد امن قائم ہو گیا۔ دونوں فریق کے لوگ آپس میں ملنے لگے۔ مومن اور غیر مومن کے درمیان دعوتی گفت گوئیں ہونے لگیں۔ علم دین چاروں طرف پھیلنے لگا (وامن الناس واجتمع بعضهم ببعض وتكلم المومن مع الكافر وانتشر العلم النافع و الايمان، ابن کثیر)

جنگ بند ہونے کے بعد جو دعوتی کام شروع ہوا اس کے نتیجہ میں قبائل کے لوگ کثرت سے مسلمان ہونے لگے۔ معاہدہ حدیبیہ کے وقت قابلِ جنگ مسلمانوں کی تعداد اگر ڈیڑھ ہزار تھی تو دو سال سے بھی کم عرصہ میں ان کی تعداد دس ہزار ہو گئی۔ چنانچہ اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف مارچ کیا تو مکہ کے سردار ابو سفیان نے اعلان کر دیا کہ اطاعت قبول کر لو، کیوں کہ آج ہمارے اندر ان سے مقابلہ کی طاقت نہیں (هذا محمد قد جاءكم فيما لا قِبَلَ لكم به فمن دخل دار ابی سفيان فهو آمن)

دعوت ایک ابدی طاقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذی قعدہ ۶ھ میں مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ آپ کے چودہ سو اصحاب تھے۔ آپ کا مقصد مکہ پہنچ کر عمرہ کرنا تھا۔ لمبا پُر مشقت سفر طے کر کے آپ حدیبیہ کے مقام پر پہونچے جو مکہ سے نو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں قریش کے لوگ آگیے اور انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ آپ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کریں۔ دو ہفتہ تک گفت گو ہوتی رہی۔ مگر قریش راضی نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ آپ خود قریش کی شرائط پر ایک صلح کر کے واپس چلے آئے جس کو تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

اس سفر سے واپسی کے بعد ہی آپ نے اطرافِ عرب کے حاکموں اور بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کیے۔ یہ دعوتی خطوط ۶ھ میں روانہ کیے گئے۔ جن لوگوں کو یہ خطوط روانہ کیے گیے ان کے نام یہ ہیں :

ہرقل	شہنشاہِ روم	مُنذربن ساویٰ	شاہِ بحرین
خسرو پرویز	شہنشاہِ ایران	جیفر و عبد جلندری	شاہِ عمان
نجاشی	شاہِ حبش	ہوذہ بن علی	حاکمِ یمامہ
مقوقس	شاہِ مصر و اسکندریہ	حارث غسانی	حاکم دمشق

اگرچہ بعض حکمرانوں نے آپ کے دعوتی مکتوب کے ساتھ متکبّرانہ معاملہ کیا اور اس کے نتیجہ میں وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے۔ مگر اکثر کے دل اس سے مرعوب اور متاثر ہوگیے اور کچھ نے اسلام قبول کرلیا۔ قیصر روم نے اپنی قوم کے ذمہ داروں سے کہا کہ آؤ ہم ان کے پیرو بن جائیں اور ان کی تصدیق کریں تاکہ ہماری دنیا اور آخرت دونوں سلامت رہیں (فهلموا فلنتبع و لنصدقه فتسلم لنا دنيانا وآخرتنا) حاکمِ یمامہ نے اپنے جواب میں لکھا کہ کتنی اچھی ہے وہ چیز جس کی طرف آپ بلاتے ہیں (ما احسن ما تدعوا اليه واجمله)

عین اس وقت جب کہ اسلام مادی اعتبار سے بیش قدمی کی پوزیشن میں نہ تھا، وہ فکری اعتبار سے اس پوزیشن میں تھا کہ شاہانِ وقت کو اپنا مخاطب بنا سکے۔ یہ تمام تر دعوت کا کرشمہ تھا۔ کوئی دشمن اسلام کے مادی اقدام پر روک لگا سکتا ہے۔ مگر اسلام کے فکری اقدام پر روک لگانا کسی کے لیے ممکن نہیں ۔

اسلام بیرون عرب میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے گیے تو اسلام عرب میں غالب آچکا تھا۔ تاہم عرب کے آس پاس ممالک میں جو قومیں آباد تھیں ان کا مذہب تہذیب اور زبان سب اسلام سے بالکل الگ تھی۔ اس وقت وہ وسیع دنیا وجود میں نہیں آئی تھی جس کو آج عرب دنیا (Arab world) کہا جاتا ہے ۔

یہ صورت حال اسلام کی زندگی کے لیے مستقل خطرہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اگر صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود رہتا تو بعد کے زمانے میں خود اس کا وجود قائم رہنا مشکل

تھا۔ اسلام کی مستقل زندگی کے لیے ضروری تھا کہ وسیع خطہ میں اسلام کا مذہب اس کی زبان اور اس کی تہذیب غالب حیثیت حاصل کرلے۔ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تقریباً نصف صدی کے اندر پیش آگیا۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ عظیم واقعہ اسلام کی دعوتی قوت کے ذریعہ پیش آیا نہ کہ اس کی سیاسی قوت کے ذریعہ۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی قوت اس قسم کے واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے ناکافی ہے۔ اگر سیاسی قوت کے ذریعہ مذہب کو بدلنا ممکن ہوتا تو آج ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سب کے سب عیسائی ممالک ہوتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بیرون عرب کی اقوام سے لڑائیاں شروع ہوئیں۔ اور اہل اسلام نے بہت کم مدت میں ایشیا سے لے کر افریقہ تک کا بہت بڑا علاقہ فتح کر ڈالا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان مفتوحہ ممالک میں کبھی بھی تبدیلیٔ مذہب کے لیے جبر نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر مصر کو لیجیے جو خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے مصر کی تاریخ پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے ۶۴۲ء میں مصر کو نہایت تیزی سے فتح کرلیا۔ مگر انھوں نے وہاں شدت کے ساتھ مذہبی رواداری (Religious tolerance) پر عمل کیا۔ مصریوں کو اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ حکومتی سطح پر انھیں ترغیب بھی نہیں دلائی گئی۔ عرب حکمرانوں نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ عیسائی گرجاؤں کو باقی رکھیں گے:

> There was no attempt to force, or even to persuade, the Egyptians to convert to Islam. The Arabs even pledged to preserve the Christian Churches (6/487-88).

اسی طرح پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب (پریچنگ آف اسلام) میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مصر کے مسلم فاتحین نے عیسائیوں کے ساتھ کامل رواداری کا ثبوت دیا۔ اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ مصری عیسائیوں کا کثرت سے اسلام قبول کرنا مسلم حکمرانوں کی طرف سے کسی ظلم یا نامنصفانہ دباؤ کا نتیجہ تھا:

> There is no evidence of their widespread apostasy to Islam being due to persecution or unjust pressure on the part of their new rulers (p. 104).

اسی طرح پروفیسر آرنلڈ نے دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ مصریوں کا قبول اسلام کسی سیاسی یا فوجی جبر کا نتیجہ نہ تھا :

These conversions were not due to persecutions (110).

اب سوال یہ ہے کہ جب اہلِ مصر پر تبدیلیٔ مذہب کے لیے جبر نہیں کیا گیا تو کیوں کر ایسا ہوا کہ ان کی بہت بڑی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا جواب مصریات کے ماہر سر آرتھر کیتھ نے ان الفاظ میں دیا ہے کہ ــــــــ مصر کے عیسائی تلوار سے فتح نہیں کیے گئے بلکہ قرآن کے ذریعہ فتح کیے گئے :

The Egyptians were conquered not by the sword, but by the Koran.
Sir Arthur Keith, *A New Theory of Human Evolution*, London, Watts & Co. 1950, p. 303.

یہی صورت تمام مفتوحہ ممالک میں پیش آئی۔ ان ملکوں کی غیر مسلم آبادی کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے کسی قسم کا جبر نہیں کیا گیا۔ یہ صرف اسلام کی دعوتی طاقت تھی جس نے انھیں مسخر کر لیا اور وہ بہت تھوڑے عرصہ میں اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گیے۔ جو مسلمان ان کے ملک میں داخل ہوئے تھے ان سے روزانہ کے میل جول میں وہ اسلام کی باتیں سنتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے اسلامی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس سے ان پر یہ بات کھلی کہ ان کے آبائی مذہب کے مقابلہ میں اسلام زیادہ معقول ہے۔ اس کی تعلیمات زیادہ سادہ اور قابل عمل ہیں۔ اس تاثر کے تحت وہ دھیرے دھیرے اسلام قبول کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت مسلمان ہو گئی اور جغرافی نقشہ پر وہ دنیا وجود میں آئی جس کو اسلامی دنیا کہا جاتا ہے۔

سلجوقی ترکوں کا قبول اسلام

سلجوق، ترکان غز کے ایک سردار کا نام تھا۔ اس نے قبائل کی ایک فوج جمع کی اور گیارہویں صدی عیسوی میں مغربی ایشیا پر حملہ کر دیا۔ اس نے ایک طاقت ور سلطنت بنائی۔ اس کی سلطنت میں اُردن، شام، عراق، فلسطین وغیرہ علاقے شامل تھے۔ ان علاقوں میں اس وقت مسلمانوں کی حکومت تھی۔ سلجوقی ترکوں نے مسلم افواج کو زیر کر کے یہاں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

سلجوق کے بعد طغرل بیگ (م ۱۰۶۳) اور الپ ارسلان (م ۱۰۷۳) وغیرہ اس کے وارث ہوئے۔ تاریخ اسلام کا یہ عظیم الشان واقعہ ہے کہ سلجوق ترک جو ابتداءً وحشی قبائل تھے، انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور ۲۰۰ سال سے زیادہ مدت تک اسلام کی پاسبانی کی۔ انھوں نے شیعہ، سنی لڑائیوں کو ختم کرکے اسلامی دنیا میں اتحاد پیدا کیا۔ انھوں نے بڑی بڑی مسجدیں اور مدرسے بنائے۔ انھوں نے اسلام کے خلاف عیسائی حملوں کا طاقت ور دفاع کیا۔

ہماری تاریخی کتابوں میں سلاجقہ کے اس قسم کے کارنامے بہت ملیں گے مگر یہ کتابیں اس بارہ میں بالکل خاموش ہیں کہ سلجوق ترکوں نے کس طرح اور کس مرحلہ پر اسلام قبول کیا۔ اسلام کی مدون تاریخ کا یہ عظیم خلا ہے کہ اس میں جنگی واقعات اور سیاسی فتوحات کی داستانیں تو نہایت تفصیل کے ساتھ ملتی ہیں۔ مگر یہ کتابیں اس عظیم تر فتح کی تفصیلات سے ہمیں آگاہ نہیں کرتیں کہ اسلام نے کس طرح لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔ اور کس طرح قومیں کی قومیں اسلام کے دائرے میں داخل ہوتی چلی گئیں۔ اسلامی تاریخ کی موجودہ کتابیں "دولت سلجوقیہ" کی تفصیلات بتاتی ہیں مگر وہ "اسلام سلجوقیہ" کی تفصیلات سے ہمیں آگاہ نہیں کرتیں۔

پورے اسلامی لٹریچر میں غالباً تاریخ دعوت کے موضوع پر ایک ہی قابلِ ذکر کتاب لکھی گئی ہے اور اس کتاب کے مصنف کا نام ٹی ڈبلیو آرنلڈ ہے۔ پروفیسر آرنلڈ مذکورہ واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests: on two great historical occasions, infidel barbarians have set their feet on the necks of the followers of the Prophet,—the Saljuq Turks in the eleventh and the Mongols in the thirteenth century,—and in each case the conquerors have accepted the religion of the conquered (p. 2).

اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ دو بڑے تاریخی مواقع پر وحشی کافروں نے اپنے پاؤں محمد کے پیرؤوں کے گردن پر رکھ دیئے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں نے، مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کرلیا۔

مغل تاتاریوں کا قبول اسلام

قدیم زمانہ میں ترکستان (روس) اور منگولیا (چین) کے علاقے میں کچھ قبائل آباد تھے جن کو ترک کہا جاتا تھا۔ ان کا ایک سردار چنگیز خاں (۱۲۲۷-۱۱۶۲) تھا۔ یہ غیر معمولی صلاحیت کا آدمی تھا۔ وہ ۲۰ ہزار جنگجو افراد کو جمع کرکے اپنے علاقہ سے نکلا اور فتوحات کرتا ہوا چین سے ایران تک پہونچ گیا۔

اس کے بعد یہ قبائل آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ہلاکو خاں (۱۲۶۵-۱۲۱۷) اٹھا۔ اس نے اسلامی سلطنت کو برباد کرنے کے بارہ میں اپنے دادا (چنگیز خاں) کے منصوبہ کو مکمل کیا۔ اس نے دار السلطنت بغداد کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اور خلیفہ مستعصم کو قتل کر ڈالا۔ تاتاری سرداروں کو مسلم حکمراں (خوارزم شاہ) سے کچھ شکایت پہونچی تھی، اس بنا پر وہ غضب ناک ہوگئے اور مسلم سلطنت کو برباد کرنے کے درپے ہوگئے۔

یہ اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ خوف ناک واقعہ تھا۔ تاتاریوں کے ظلم و فساد کی بنا پر اسلامی دنیا میں ان کا اتنا زیادہ ہول طاری ہوا کہ کہا جانے لگا: اذا قيل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق (اگر کہا جائے کہ تاتاری شکست کھا گئے تو یقین مت کرنا)

یہ ہولناک مسئلہ بھی دعوت ہی کے ذریعہ حل ہوا۔ تاتاری جب مسلمانوں کا خون پوری طرح بہا چکے تو ان کے انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑگئی۔ اب انھوں نے اپنی "رعایا" کے مذہب پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا شروع کیا۔ مختلف طریقوں سے تاتاریوں کا سابقہ مسلمانوں کے ساتھ پیش آتا تھا۔ بے شمار مسلمان مرد اور عورتیں گرفتار ہوکر ان کے گھروں پر پہنچیں، سڑکوں اور بازاروں میں مختلف اسباب کے تحت ایک تاتاری کی ملاقات ایک مسلمان سے ہوتی تھی۔ تاتاری حکمرانوں کے دربار میں مسلمان جاتے رہتے تھے۔ اس طرح مختلف طریقہ سے تاتاری لوگ اسلام کی تعلیمات سے آشنا ہوئے اور اس سے تعارف حاصل کیا۔

اس کے بعد ان کے اسلام قبول کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اولاً ان کے حکمرانوں اور سرداروں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد عام تاتاریوں نے اس کی پیروی کی۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اسلام کی عمارت کو ڈھایا تھا

دہی دوبارہ اسلام کی عمارت تعمیر کرنے والے بن گیے۔ تاریخ اسلام کے اس عظیم دعوتی واقعہ کی تفصیل پیش کرتے ہوئے پروفیسر آرنلڈ نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ فاتح نے مفتوح کے مذہب کو اختیار کرلیا:

The conquerors have accepted the religion of the conquered.

پروفیسر فلپ ہٹی نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ہسٹری آف دی عربس میں لکھا ہے:

The religion of the Muslims had conquered where their arms had failed (p. 488).

مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے۔

سب کچھ چھننے کے بعد بھی

دعوت ایک ایسی طاقت ہے جو اہل ایمان کے پاس اس وقت بھی باقی رہتی ہے جب کہ ان کا سب کچھ ان سے چھن چکا ہو۔ اس کی ایک سبق آموز مثال وہ ہے جو افریقہ میں پائی جاتی ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں دکھایا ہے کہ الجزائر کے بربری قبائل میں اسلام کس طرح پھیلا۔ ان قبائل میں کچھ لوگ عیسائی تھے اور زیادہ تر وہ لوگ تھے جو قدیم مشرکانہ مذہب پر قائم تھے۔

یہ لوگ پہاڑی علاقہ میں رہتے تھے اور پہاڑوں کے حصاروں میں بند تھے۔ قبائلی مزاج کے تحت وہ اپنی خودمختاری کے دل دادہ بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے عرصہ تک اپنے یہاں عربی عناصر کے داخلے کو کامیابی سے روکا، لہذا ان کو مسلمان بنانے میں بہت سی مشکلات حائل تھیں۔ اس سے پہلے قادریہ سلسلہ کی ایک خانقاہ (ساقیۃ الحمرا) کے صوفیوں نے ان کے یہاں ایک تبلیغی مشن قائم کرنے کی کوشش کی تھی، مگر انھیں اس کام میں کامیابی نہ ہوئی۔ ان کے درمیان اسلام کے لیے راستہ ہموار کرنے کا سہرا اندلسی مسلمانوں کے سر ہے جو سقوطِ غرناطہ (۱۴۹۲ء) کے بعد اسپین سے نکال دیے گیے تھے، اور اس خانقاہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ خانقاہ کے شیخ نے دیکھا کہ یہ لوگ تبلیغ کے اس دشوار کام کے لیے بہت موزوں ہیں جس کے سرانجام دینے میں ان کے اپنے مریدوں کی کوششیں ناکام رہی تھیں۔ اس کام پر روانہ کرنے سے پہلے انھوں نے ان کو ان الفاظ میں مخاطب کیا:

"ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسلام کی مشعل اُن ملکوں میں لے جائیں جو برکاتِ اسلام کی نعمت سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان بدقسمت قبائل کے ہاں نہ تو مدارس ہیں اور نہ کوئی شیخ ہے جو اُن کے بچوں کو اصولِ اخلاق اور محاسنِ اسلام کی تعلیم دے سکے۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح رہتے ہیں جن کو نہ خدا کا علم ہے، نہ دین کا۔ لہٰذا میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس ناگوار صورتِ حال کی اصلاح کے لیے تمہاری دینی حمیت اور تمہارے نورِ ایمان سے درخواست کروں تاکہ یہ کوہستانی لوگ اپنی قابلِ رحم جہالت کی دلدل میں غلطاں و پیچاں نہ رہیں اور ہمارے دین کی شاندار صداقتوں سے باخبر ہو جائیں۔ جاؤ اور ان کے ایمان کی بجھتی ہوئی آگ کو ہوا دو اور اس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ روشن کرو۔ اپنے پہلے مذہب یعنی عیسائیت کی جس ضلالت سے وہ اب تک آلودہ ہیں، اس سے ان کو پاک کرو اور ان کو یہ سمجھاؤ کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں عیسائیت کے برعکس میل کچیل اللہ تعالیٰ کی نظروں میں مقبول نہیں ہے۔ میں تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ تمہارے کام میں بہت سی دشواریاں ہیں۔ لیکن تمہاری ناقابلِ تسخیر حمیتِ اسلامی اور حرارتِ ایمانی خدا کے فضل و کرم سے تمام مشکلات پر غالب آئے گی۔ میرے بچو! جاؤ، اور اس بدنصیب قوم کو خدا اور اس کے رسول کی طرف دوبارہ لاؤ جو اس وقت جہالت اور کفر کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ان کو نجات کا پیغام پہنچاؤ۔ خدا تمہارے شاملِ حال رہے اور تمہاری مدد فرمائے۔"

یہ مبلغ پانچ پانچ، چھ چھ کی جماعتوں میں مختلف اطراف میں روانہ ہو گیے۔ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں عصا لیے چل دیے اور انھوں نے پہاڑوں کے سنسان اور غیر آباد مقامات کا انتخاب کر کے وہاں کے غاروں میں چٹانوں کے درمیان خانقاہیں قائم کیں۔ قبائل کے درمیان ان کی پرہیزگاری اور عبادت گزاری کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ یہ قبیلے جلد ہی ان کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے لگے۔ ان مبلغوں نے آہستہ آہستہ اپنے علمِ طب اور صنعت و حرفت اور تمدن کے دوسرے فوائد کی بدولت بربری قبائل کے یہاں کافی اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ حتیٰ کہ ہر خانقاہ اسلامی تعلیم و دعوت کا مرکز بن گئی۔ ان نو واردوں کے علم و فضل کی کشش سے بہت سے لوگ علم کی طلب میں ان کے گرد جمع ہو گیے۔ کچھ عرصہ بعد یہی طالب علم اپنے ابنائے وطن میں اسلام کی تبلیغ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کا مذہب بربری قبائل کے تمام علاقوں اور الجزائر کی تمام بستیوں میں پھیل

گیا (صفحہ ۲۹ - ۱۲۸)

جزائر ملایا میں اسلام

جنوب مشرقی ایشیا کے علاقہ میں ۲۰۰ ملین (۲۰ کروڑ) مسلمان ہیں۔ صرف انڈونیشیا میں ۱۲۰ ملین مسلمان ہیں۔ یہ تعداد کسی بھی دوسرے مسلم ملک سے زیادہ ہے۔ اس علاقہ میں مسلمانوں کی کثیر تعداد کا سب سے زیادہ اثر انگیز پہلو یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر صرف تبلیغی عمل کے ذریعہ مسلمان ہوئے ہیں۔ اس علاقہ میں کبھی بھی مسلمانوں کی طرف سے کوئی فوجی اقدام نہیں کیا گیا۔

اس علاقہ میں اسلام کا نمایاں ظہور ۱۳ ویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اور یہی وہ صدی ہے جس میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت پر زوال آیا۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے لکھا ہے کہ جزائر ملایا کی تاریخ پچھلی چھ صدیوں میں اسلامی تاریخ کا نہایت دلچسپ باب پیش کرتی ہے۔ جہاں اسلام کی اشاعت تمام تر صرف تبلیغی کوششوں کے ذریعہ ہوئی (صفحہ ۳۶۷)

۱۳ ویں صدی وہ صدی ہے جب کہ اسپین میں اسلامی سلطنت پر زوال آیا۔ اور یہی وہ صدی ہے جب کہ اسلام جزائر ملایا میں فکری فتح حاصل کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کرافورڈ (Dr. Crawford) نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بڑا عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ اسلامی مذہب عین اس وقت ایشیا میں بڑھ رہا تھا جب کہ وہ یورپ سے نکال دیا گیا تھا:

> It may be remarked as a singular co-incidence that the Mohammedan religion was extending itself thus in Asia at the very time it was expelled from Europe.

پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھتے ہیں کہ بعد کے سالوں میں اگرچہ اسلام کی عظیم سلطنت ٹوٹ گئی اور اسلام کی سیاسی طاقت بہت گھٹ گئی تب بھی اس کی روحانی فتوحات کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہیں۔ جب منگول قبائل نے ۱۲۵۸ میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی عظمت کو خون میں غرق کر دیا، اور جب فرڈیننڈ نے ۱۲۳۶ میں مسلمانوں کو قرطبہ سے نکال دیا اور غرناطہ کے مسلم سلطان نے عیسائی بادشاہ کو خراج ادا کیا اس وقت اسلام سماترا میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور جزائر ملایا میں فاتحانہ اقدام کر رہا تھا۔ سیاسی انحطاط کے لمحات میں اسلام نے

اپنی بعض شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں (صفحہ ۲)

وان لیر (Van Lear) نے لکھا ہے کہ جو شخص بھی انڈونیشیا کی تاریخ میں داخل ہوتا ہے وہ ایک نامعلوم دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی پُراسرار، معجزاتی طاقت کارفرما تھی جس نے جنوب مشرقی ایشیا کے لوگوں کو اسلام میں داخل کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ ایک معجزاتی طاقت اس اشاعت اسلام کے پیچھے کام کر رہی تھی۔ مگر یہ کوئی پُراسرار طاقت نہ تھی بلکہ یہ اسلام کی دعوتی طاقت تھی۔ اسلام کی دعوتی طاقت کے اندر بلاشبہ اس بات کی معجزاتی صلاحیت چھپی ہوئی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچے اور لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے کے لیے مجبور کر دے۔

اس علاقے میں اسلام تاجروں کے ذریعہ داخل ہوا۔ تاجر کے اندر جو اخلاقیات ہوتی ہیں وہ داعی کی اخلاقیات ہیں۔ بہترین داعی وہی ہے جو تاجر کی طرح مدعو کے ساتھ معاملہ کرے۔ ایسا داعی کبھی اپنے مشن میں ناکام نہیں ہوسکتا۔

الکس ڈی ٹاکویل (Alex de Toqueville) نے لکھا ہے کہ تجارت متشدّدانہ جذبات کی قاتل ہے۔ تجارت اعتدال اور مفاہمت کو پسند کرتی ہے۔ تاجر آدمی اس معاملہ میں نہایت محتاط ہوتا ہے کہ وہ غصہ سے اعراض کرے۔ تاجر برداشت والا ہوتا ہے۔ تجارت ایک تاجر کے اندر یہی صفات پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے ایک مفکر نے کہا ہے کہ خدا تجارت کو اپنا مبلغ بناتا ہے:

God is making commerce His missionary.

اسلامی دعوت بیسویں صدی میں

بیسویں صدی مسلم تحریکوں کی صدی ہے۔ اس صدی میں مسلمانوں نے بے شمار بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں۔ یہ تمام کی تمام سیاسی اور انقلابی تحریکیں تھیں۔ ان تحریکوں کو افراد اور وسائل کا اتنا زیادہ سرمایہ ملا جو کمیت کے اعتبار سے انھیں کامیاب بنانے کے لیے کافی تھا۔ مگر یہ تحریکیں اپنی تمام تر وسعت کے باوجود ناکام ہو کر رہ گئیں۔ ان سے امت کو کسی بھی قسم کا کوئی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ یہ تحریکیں طوفان کی طرح اٹھیں اور گرد و غبار کی طرح مٹ گئیں۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کا یہ حال سیاسی اعتبار سے تھا۔ مگر عین اسی صدی میں اسلام کی دعوتی طاقت ہر ملک کے لوگوں کو مسخر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگرچہ اسلامی دعوت کے میدان میں مسلم قائدین نے کوئی بھی قابلِ ذکر کوشش نہیں کی۔ مگر اسلام اپنی ذاتی قوت سے مسلسل لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتا رہا ہے۔

پچھلے ایک سو سال کے اندر دنیا کے مختلف حصوں میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ یہاں ہم ان میں سے کچھ افراد کا نام بطور علامت درج کر رہے ہیں۔ اس فہرست سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح پچھلے سو سال کے اندر ہر زمانہ میں لوگ اسلام قبول کرتے رہے ہیں۔ ناموں کے سامنے ان کے قبولِ اسلام کا سن دیدیا گیا ہے:

1	Prof. Haroon Mustafa Leon	England	1822
2	Mohammad Alexander Russel Webb	U.S.A.	1890
3	Dr Nishikanta Chattopadhya	Hyderabad	1904
4	Lord Headly al-Farooq	England	1913
5	Dr William Burchell B. Pickard	England	1922
6	Sir Abdulla Archibald Hamilton	England	1923
7	Mohammad Leopold Asad	Austria	1926
8	Muhammad Marmaduke Pickthall	England	1935
9	Dr Abdul Karim Germanus	Hungary	1940
10	Dr ali Muhammad Mori	Japan	1947
11	Dr Ali Selman Benoist	France	1953
12	Dr R.L. Mellema	Holland	1955
13	Ibrahim Khalil Phillips	Egypt	1960
14	Prof. A.H.B. Hewett	U.S.A.	1966
15	Umar Bongo (President, Gabon)	Gabon	1973
16	Dr Roger Garoudy	France	1982
17	Moosa Fondi	Tanzania	1986
18	Abdullah Adiar	Madras	1987

یہ تمام لوگ وہ ہیں جنھوں نے بطور خود اسلام کا مطالعہ کیا۔ ان کو اسلام کی تعلیمات نے متاثر کیا۔ ان میں سے کئی لوگوں نے اسلام کو براہِ راست سمجھنے کے لیے عربی زبان سیکھی۔ اور آخرکار اسلام قبول کر لیا ——— بیسویں صدی مسلمانوں کے لیے بحیثیت قوم ناکامی کی صدی ہے، مگر عین اسی صدی میں اسلام بحیثیت دین کے مسلسل آگے بڑھتا رہا ہے اور بڑھ رہا ہے۔

حرفِ آخر

اسلام کی پوری تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ اسلام کی دعوت اسلام کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسلام عین انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ اگر وہ اپنی اصلی صورت میں انسان

کے سامنے لایا جائے تو وہ سیدھا آدمی کے دل میں اتر جاتا ہے، وہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی صداقت کا اعتراف کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنی ذات میں تسخیری طاقت رکھتا ہے۔ وہ خود لوگوں کو متاثر ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

مگر اس طاقت کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام اور اس کے مخاطب کے درمیان سے تمام نفسیاتی رکاوٹیں دور کر دی گئی ہوں۔ دور اوّل کے مسلمان اس راز کو جانتے تھے۔ چنانچہ وہ جن قوموں کے درمیان گئے اور جن ممالک کو فتح کیا، انھوں نے ان کے ساتھ کامل رواداری کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے ہر ایک کو اس کے مذہب کی پوری آزادی دی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انھوں نے لوگوں کے ساتھ قومی نزاع کھڑی کی یا مذہب کے معاملہ میں ان پر جبر کرنا شروع کیا تو ان کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہو جائے گی۔ ضد کی بنا پر وہ ایک ماننے والی چیز کو بھی ماننے سے انکار کر دیں گے۔

مشہور انگریز مورخ ہنری ٹامس بکل (۱۸۶۲-۱۸۲۱) نے قدیم مسلمانوں کی اس حکمت اور تدبر کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اسلامی مبلغ بے حد سمجھ دار اور دور اندیش ہیں:

The Mahometan missionaries are very judicious (p. 409).

پروفیسر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام *(The Preaching of Islam)* میں اس کے مصنف نے نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ دور اول کے مسلمانوں نے ہر جگہ مکمل مذہبی رواداری کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے باوجود کبھی غیر مسلموں کے ساتھ مذہبی جھگڑے نہیں کھڑے کیے۔ اور یہ بہت بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر دور قدیم کی آباد دنیا کا بہت بڑا حصہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گیا۔

اسلام کی یہ دعوتی قوت آج بھی ظاہر ہو سکتی ہے، بشرطیکہ موجودہ مسلمان وہ تمام قومی نزاعات ختم کر دیں جو وہ ہر ملک میں اپنے غیر مسلم ہمسایوں سے چھیڑے ہوئے ہیں۔ یہ قومی نزاعات جن کو غلطی سے "جہاد" کا نام دیدیا گیا ہے، اسلام کی دعوتی قوت کے ظہور میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جس دن یہ نزاعات ختم ہوں گے، اسی دن اسلام کا دعوتی سیلاب موجزن ہو جائے گا اور اس وقت تک نہ تھمے گا جب تک وہ اپنی آخری حد کو نہ پہونچ جائے۔

ہر انسانی گروہ کا ایک نظامِ عقائد ہوتا ہے اور ایک اس کا نظامِ اقتدار۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان نظامِ اقتدار کے اعتبار سے دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے ہیں۔ لیکن نظامِ عقائد کے اعتبار سے آج بھی وہ تمام قوموں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ مگر مسلمانوں کے قائدین ساری دنیا میں یہ کر رہے ہیں کہ وہ نظامِ اقتدار کے میدان میں دوسری قوموں سے ٹکرا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے حصہ میں شکست اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں آرہا ہے۔ اگر وہ اس بے فائدہ ٹکراؤ کو ختم کر دیں اور نظامِ عقائد کے میدان میں دوسری قوموں کو اپنا مخاطب بنائیں تو بہت جلد وہ دیکھیں گے کہ ان کی شکست کی تاریخ فتح کی تاریخ میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اسلام کو فکری طاقت کی حیثیت سے اٹھائیے۔ اِس کے بعد وہ فکری اعتبار سے بھی دنیا پر غالب آجائے گا اور نتیجۃً دوسرے تمام اعتبارات سے بھی۔

واقعاتِ سفر

(مصر میں) ہمارے پہنچنے سے پہلے ہماری کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین اہلِ علم وفکر کے حلقہ میں پہنچ چکی تھی اور اس نے اپنی جگہ پیدا کرلی تھی، وہ میرے لیے ایک بطاقۃ الزیارۃ اور ایک تعارف نامہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اکثر جگہ یہ کہنا کافی ہوتا تھا: مولف ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین (صفحہ ۳۶۸) عبدالحمید سعید ہال میں میری تقریر العالم علیٰ مفترق الطرق کے عنوان سے ہوئی۔ اس تقریر کا عام طور پر چرچا ہوا۔ اس کے بعد ایک صاحبِ قلم استاذ عبدالمنعم خلّاف نے اپنی تقریروں میں بڑے اچھے تبصرے کیے (۳۶۹) میرا ایک مقالہ مصر کے مقبول ترین رسالہ (الرسالہ) میں شائع ہوا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے اس کو ایک الگ رسالہ کی شکل میں مصر ہی میں (اسمعی یا مصر کے عنوان سے شائع کروایا اور وہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور بڑے شوق اور دل چسپی سے پڑھا گیا (۳۷۵) حمص میں مرکز اخوان المسلمین میں ۲۹ جولائی ۱۹۵۱ کو میری ایک ولولہ انگیز تقریر ہوئی۔ حلب کے بھی ایک بھرے جلسہ میں میری ایک پُرجوش تقریر ہوئی (۳۹۰) ان تقریروں کے علاوہ میرا ایک اہم مضمون وہاں کے واحد عربی اخبار البلاد السعودیۃ میں شائع ہوا (۳۹۲) واپسی میں لکھنؤ کے اسٹیشن پر تبلیغی احباب اور لکھنؤ کے دوستوں کی ایک بڑی تعداد استقبال کے لیے موجود تھی (۳۹۳) مصر اور شام سے واپسی پر لکھنؤ کی تبلیغی جماعت کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں مسلم اور غیر مسلم سبھی شریک تھے۔ وہاں میں نے تقریر کی۔ بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ اس جلسہ میں حاضرین کی اتنی تعداد تھی جو بڑے سے بڑے سیاسی رہنما حتیٰ کہ جواہر لال کے خطاب میں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ من جانب اللہ بات تھی کہ مضامین کی ایسی آمد اور تقریر میں ایسی روانی اور جوش تھا کہ سامعین ایک سکتہ کے عالم میں تھے۔ بہت سے رکشے والوں نے جن کا اڈہ قریب تھا، سواری لینے سے انکار کردیا اور کھڑے سنتے رہے۔ اس جلسہ کی ایک خصوصیت یہ تھی جو میرے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ بھائی صاحب مرحوم بھی پاس کی ایک عمارت میں بیٹھے ہوئے تقریر سن رہے تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی محنت اور تربیت ذہنی پر مسرور و مطمئن ہوئے ہوں گے (۳۹۷) سیوان میں شب کے مخلوط اجتماع میں حسبِ معمول تقریر کرکے بیٹھنا چاہتا تھا کہ جلسہ سے آوازیں آئیں کہ ابھی اور فرمائیے ہم ابھی سننا چاہتے ہیں۔ میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ ایک سن رسیدہ ہندو اسٹیج پر ونڈر فل، ونڈر فل کے الفاظ کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ ہم لوگوں نے ان کو مہذب طریقہ پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اسٹیج تک پہونچ گیے۔ معززینِ شہر نے بتایا کہ یہ یہاں کے بہت کامیاب وکیل اور یہاں کی پرجا سوشلسٹ پارٹی کے سکریٹری یا صدر ہیں۔ انھوں نے مائک پر کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں دو تقریریں سنی ہیں جن سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ ایک مسٹر سی آر داس کی تقریر اور

ایک آج مولانا صاحب کی (۴۰۰) لاہور کے سفروں میں ہمارے فاضل دوست مولانا عطاء اللہ حنیف نے میرے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی۔ مجھے اس دعوت و اعزاز کے قبول کرنے میں کوئی تردد نہیں ہوا۔ لیکن اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب مجھے وہاں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا اور مولانا سید داؤد غزنوی صاحب نے اس کو خود پڑھا (۴۱۰) مجھے دمشق یونیورسٹی کا دعوت نامہ (۱۹۵۵) ملا۔ میں اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا کہ مجھے ایک ترقی یافتہ عرب ملک (شام) کی ایک مؤقر دانش گاہ کی طرف سے ایسی دعوت آنے پر بڑی مسرت ہوئی اور میں نے اس کو ایک علمی اعتماد و اعزاز کا مرادف سمجھا۔ یہاں مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے ایک خط کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے تحریر فرمایا کہ "اخبار میں اس تاریخی امتیاز کی خبر پڑھی جو صدیوں کے بعد ہندستان کو حاصل ہوا۔ علامہ صفی الدین بداؤنی کے بعد شاید آپ دوسرے ہندی عالم ہیں جن کو شام میں پڑھانے اور اپنے علوم سے شامیوں کو فائدہ پہونچانے کا موقع ملا (۴۲۱) یہ حسن اتفاق تھا کہ اسی اپریل ۱۹۵۶ میں جب کہ مجھے سفر کرنا تھا، بمبئی سے دمشق کے لیے پہلی مرتبہ ایر انڈیا کی ڈائرکٹ سروس شروع ہوئی۔ اپنے مخلص دوست و کرم فرما عالی مرتبت شیخ یوسف الفوزان سفیر مملکت سعودیہ کی سفارش و کوشش سے مجھے اس کے فرسٹ کلاس کی ایک سیٹ مل گئی۔ چونکہ یہ ہندستان اور شام کے مابین پہلی پرواز تھی، اس کی فلم لی گئی جس کا مجھے پتہ نہیں چلا۔ لیکن لکھنؤ کے پہچاننے والوں نے کسی سنیما میں یہ فلم دیکھی اور جہاز سے اترتا ہوا مجھے دیکھا اور عزیزوں کو بتایا کہ انھوں نے مجھے دمشق میں دیکھا۔ ہوائی اڈہ پر ہمارے اصل داعی اور ان کے متعدد احباب موجود تھے جو بڑی محبت اور تپاک سے ملے اور میری آمد پر مسرت کا اظہار کیا (۴۲۳) دمشق میں آخری محاضرہ (۲۶ مئی ۱۹۵۶) سے پہلے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے مہمان کے اعزاز میں دمشق کے بڑے ہوٹل نادی الشرق میں ظہرانہ دیا گیا جس میں یونیورسٹی کے پروفیسر اور بہت سے معززین شہر مدعو تھے (۴۲۵) حلب میں اخوان کے مرکز میں میری ایک اہم تقریر حاجتنا الی ایمان جدید کے عنوان سے تھی۔ تقریر ختم ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ محبت کا دریا امنڈ آیا۔ کم کبھی کسی مجمع نے اپنی محبت کا اس طرح والہانہ اظہار کیا ہوگا (۴۳۲) کراچی میں ایک دن سفیر شام نے میرے اعزاز میں سفارت خانہ میں دعوت کی جس میں علامہ محمد بشیر الابراہیمی اور مولانا محمد یوسف بنوری نے شرکت کی (۴۴۰) حیدرآباد میں ایک روز پرنس مکرم جاہ بہادر نے بھی کھانے پر بلایا جہاں پروفیسر الیاس برنی سے بھی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑی عنایت فرمائی۔ مولانا الیاس برنی نے میرے ان مضامین کی تحسین کی جو ہندستانی مسلمانوں کی خدمات کے سلسلے میں لکھے گئے تھے (۴۵۱) ہم ۱۸ دسمبر ۱۹۶۰ کو رنگون پہونچے۔ اخبارات میں چھپا کہ آزاد برما میں کسی عالم کا اس سے پہلے ایسا استقبال نہیں ہوا (۴۵۷)

ماخوذ از کاروانِ زندگی، حصہ اول، مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA
☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name ....

Address ....

....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:
☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Name ....

Address ....

....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76 August 1987 No 129



ISLAMIC LITERATURE

In Contemporary Idiom by Maulana Wahiddudin Khan

Our publications aim at presenting Islamic teachings in contemporary scientific idiom. Apart from over 60 books in Urdu, English, Arabic and Hindi, we publish two thought-provoking monthly magazines entitled *AL-RISALA* in Urdu and English.



Monthly *AL-RISALA* has two-fold aim: to introduce Islam as a divine message to all mankind: and to promote a positive and constructive thinking among the people.

Annual subscription: Rs. 48 (inland); US $ 25 (abroad by airmail); US $ 10 (by surface mail)

AL-RISALA CASSETTE

This series of lectures and talks recorded on cassettes aims at creating a spiritual awareness and stimulating constructive thinking.

Price per Cassette: Rs. 25, US $ 5.

THE ISLAMIC CENTRE
C-29 Nizamuddin West,
New Delhi - 110013 (India)
Tel. 611128, 697333

Rs. 4